سپنے سب اپنے

محی الدین نواب

لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں کالج کے احاطہ سے نکل رہی تھیں ان میں سے بعض اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ رہی تھیں اور بیشتر ایسی تھیں' جو بس اسٹاپ پر آکر کھڑی ہوگئی تھیں......... پنّا پان شاپ کے سامنے کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے کہا۔ "پنّا بھائی! ایسا مسالے دار پان لگانا کہ ململ کے دوپٹے کی طرح ہونٹ لال ہو جائیں۔"

بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی ایک لڑکی نے لال دوپٹے والی سے کہا۔ "کچھ سنا؟ تیرے لال دوپٹے کو دیکھ کر بول رہا ہے۔"

سرخ دوپٹے والی نے کہا۔ "اونہہ۔ سینڈل سے منہ لال کر دوں گی۔ پان کھانا بھول جائے گا۔"

اسی بس اسٹاپ پر کچھ اسمارٹ قسم کے نوجوان اپنی کار اور موٹر سائیکلوں کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ ایک نوجوان نے ایک موٹی بھاری بھرکم سی لڑکی کی جانب دیکھ کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یار! فلم اسٹار سلیم موٹا کی تانیث کیا ہے؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "سلمیٰ موٹی۔"

ایک لڑکی آہستگی سے بولی۔ "اے سلمیٰ! یہ تجھے کہہ رہے ہیں۔"

سلمیٰ موٹی نے ذرا شرما کر کہا۔ "میری صحت ایسی ہے کہ سب ہی جلتے ہیں پروانوں کی طرح..........."

"ہائیں؟" ساری لڑکیاں اسے حیرانی سے دیکھنے لگیں۔ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ "بابرا وہ دیکھ تیرا اسکوٹر والا آگیا۔"

ایک نوجوان تیزی سے اسکوٹر ڈرائیو کرتا ہوا آیا پھر لڑکیوں کے قریب زوردار بریک لگا کر رک گیا۔ بابرا نے اسے غصے سے دیکھا پھر منہ پھیر لیا۔ نوجوان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جانِ من! آپ کے لئے آندھی طوفان کی طرح ٹریفک کی بھیڑ سے گزر کر آیا ہوں تشریف لائیں آپ کے لئے میری گاڑی کی اور میرے دل کی ایک سیٹ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔"

بابرا نے بگڑ کر کہا۔ "اگر آپ اپنی خیریت چاہتے ہیں تو شرافت سے چلے جائیں

ورنہ........"

"ورنہ آپ بھی ساتھ چلیں گی۔"

تمام لڑکے قہقہے لگانے لگے۔ بابرا زیرِ لب مسکرائی۔ پھر غصے میں آگے بڑھی۔ وہ اسکوٹر آگے بڑھا کر لڑکوں کی ٹیم میں پہنچ گیا۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "مسٹر آصف! آپ جیسا دلیر عاشق پہلی بار دیکھا ہے جو سب سے مغرور لڑکی ہے' آپ اسی کو چھیڑتے ہیں۔"

آصف نے کہا۔ "اجی صاحب! ابھی آپ لوگوں نے میری دلیری کہاں دیکھی ہے۔ میں دور سے اشارے نہیں کرتا۔ کسی لڑکی کو راستہ چلتے نہ چھیڑتا ہوں' نہ اسے تماشہ بناتا ہوں۔ میں تو دو ٹوک فیصلہ کرتا ہوں جسے چاہتا ہوں اس کے گھر میں گھس کر عشق کرتا ہوں۔"

ایک نے طنز کیا۔ "آپ تو ڈینگیں مار رہے ہیں۔ کیا آپ اس مغرور لڑکی کے گھر میں جا کر اس سے عشق کر سکتے ہیں؟"

"ہوں........" آصف نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ پلٹ کر بابرا کی جانب دیکھا' پھر پوچھا۔ "دوستو! اگر میں سر پر کفن باندھ کر اس کے گھر میں داخل ہو جاؤں تو کیا شرط ہارو گے؟"

"جو آپ کہیں گے۔"

"اچھا تو پانچ سیر مٹھائی خرید لو۔ میں اپنے ہاتھ سے اس حسینہ کا منہ میٹھا کروں گا۔"

ایک نے کہا۔ "بڑی خوش فہمی ہے۔ شرط ہارنے پر آپ مٹھائی کھلائیں گے؟"

آصف نے کہا۔ "یارو شرط ہارنے پر تو میں لڑکی کے گھر سے جوتے کھا کر نکلوں گا۔ اگر مٹھائی کھانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ جوتے بھی کھانا پڑیں گے۔"

سب نے انکار میں سر ہلایا ایک نے کہا۔ "اوہ نہیں بھائی۔ ہارنے پر جوتے اور جیتنے پر مٹھائی آپ ہی کھائیں۔ ہم صرف تماشہ دیکھیں گے' چلو یار پانچ سیر مٹھائی کے لئے چندہ کرو۔"

ایک لڑکی نے لڑکیوں کی ٹیم میں پہنچ کر کہا۔ "کچھ سنا تم لوگوں نے؟ وہ جو آصف اسکوٹر والا ہے ناں' وہ آج بابرا کے گھر گھسنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔"

"اچھا........؟" سب نے تعجب کا اظہار کیا بابرا ہونٹ بھینچ کر غصے سے آصف کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "اس بدمعاش کی پٹائی کرنے کا یہ اچھا موقع ہے کیوں بابرا؟"

"آں۔" بابرا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم سب مل کر اس کی مرمت کریں۔ تم سب میرا ساتھ دو گی تو مزا آجائے گا۔"

"ارادہ کیا ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"نیک ارادہ ہے........ قریب آجاؤ۔"

وہ سب قریب آکر بابرا کی رازدارانہ سرگوشیاں سننے لگیں پھر سب نے تائید کی۔

"گڈ آئیڈیا........ مزہ آجائے گا۔ اسے خوب کھلایا پلایا جائے گا۔ پھر سارا کھانا جوتوں اور چپلوں سے ہضم کرایا جائے گا۔"

بابرا نے کہا۔ "تو پھر نکالو پیسے۔ چندہ جمع کرو........"

وہ سب اپنے پرس اور اپنی کتابوں سے دس دس کے ایک ایک دو دو نوٹ نکالنے لگیں۔ اتنے میں بس آگئی۔ لڑکے اپنی کار اور اپنے اپنے اسکوٹر پر بیٹھنے لگے۔ آصف نے سر گھما کر دیکھا۔ لڑکیاں یکے بعد دیگرے بس کے اندر جا رہی تھیں۔ بابرا نے آصف کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرانے لگی۔ پیچھے سے ایک لڑکی نے دھکا دے کر کہا۔ "ارے تم تو یہیں پھسل رہی ہو........"

بابرا نے بس پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ "اری نہیں۔ اسے چارہ ڈال رہی ہوں۔"

کار میں بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے آصف سے پوچھا۔ "کیا پھنس گئی؟"

"نہیں۔ ابھی چارہ ڈال رہا ہوں........" آصف نے اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا۔ ایک نوجوان پیچھے آکر بیٹھ گیا بس آگے بڑھی تو اس کے آگے پیچھے کار اور اسکوٹریں یوں دوڑنے لگے جیسے بس میں بیٹھنے والیوں کا محاصرہ کر لیا ہو۔ بس کے اندر ایک لڑکی نے کہا۔ "ارے' یہ تو پوری فوج آرہی ہے۔"

بابرا نے کہا۔ "پروا نہ کرو........ باجماعت پٹائی ہو گی۔"

کار ڈرائیو کرنے والے نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے؟ آصف شرط جیت لے گا؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ "یہ بندہ مجنوں کا بھی باپ لگتا ہے مجنوں پتھر کھانے کے لئے ہائے لیلیٰ کہتا تھا۔ یہ مٹھائی کھانے کے لیے اپنی عزت کو داؤ پر لگا رہا ہے۔"

آگے جا کر بس اور گاڑیوں کی رفتار بالکل ہی سست ہو گئی کیونکہ سامنے سے بارات آرہی تھی۔ پھولوں سے سجی ہوئی کار میں دولہا دلہن بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف نے اسکوٹر کو آگے بڑھا کر دیکھا۔ دلہن تو کوئی اور تھی لیکن اسے بابرا دلہن کے روپ میں نظر آئی وہ

بڑی چاہت سے اسے دیکھنے لگا۔

بابرا نے بس کی کھڑکی سے جھانک کر گزرنے والی بارات کو دیکھا کار میں بیٹھا ہوا دلہا تو کوئی اور تھا لیکن اسے آصف دلہا کے روپ میں نظر آیا۔ بابرا کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے سامنے منظر بدل گیا۔ وہ سہاگ کی سیج پر دلہن بنی بیٹھی تھی اور آصف اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس پر جھک رہا تھا۔

انسان پرائی مسرتیں دیکھ کر اپنی مسرتوں اور آرزوؤں کے ہجوم میں بھٹکنے لگتا ہے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے آصف کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ "بھائی خواب دیکھ رہے ہو کیا؟ وہ بس نکلی جا رہی ہے۔"

اس نے اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔ بابرا بس کی کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر دیکھ رہی تھی۔ ایک سینما گھر کی پیشانی پر کسی فلم کا بہت بڑا بینر لگا ہوا تھا۔ بینر کی تصویر میں ایک جوان عورت ایک ننھے سے بچے کو چوم رہی تھی۔ چشمِ زدن میں بابرا نے اس عورت کی جگہ خود کو دیکھا وہ ننھے بچے کو چوم رہی تھی اس کے بعد آصف بیک وقت اسے اور بچے کو بازوؤں میں سمیٹ کر چومنے جا رہا تھا۔

پھر وہ چونک گئی۔ اس کی سہیلی پوچھ رہی تھی۔ "کیا خواب دیکھ رہی ہو؟ چلو اٹھو اپنی منزل آ رہی ہے۔"

بس ایک اسٹاپ پر پہنچ کر رک گئی۔ لڑکیاں بس سے اترنے لگیں کار اور اسکوٹر سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اور جوانوں کی فوج آصف کے اطراف جمع ہو رہی تھی۔ دوسری طرف لڑکیاں ایک کنفکشنری کی دکان میں داخل ہو گئی تھیں۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "یار! یہ لڑکیاں بھی کھانے کی چیزیں خرید رہی ہیں.........."

آصف نے کہا۔ "جناب! آپ بھی یہاں سے پانچ سیر مٹھائی خرید لیں۔"

وہ مٹھائی......... خریدنے چلا گیا۔ دوسرے نے پوچھا۔ "مسٹر آصف! آپ ایک نوجوان لڑکی کے گھر میں داخل ہونے والے ہیں۔ آپ کا دل تو ضرور گھبرا رہا ہو گا؟"

"گھبرانے کی کیا بات ہے؟" آصف نے کہا۔ "اگر وہاں لڑکی کے ماں باپ ہوئے تو میں شادی کا پیغام دے دوں گا۔"

"اگر لڑکی نے تمہاری بے عزتی کی تو.........؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم سب ایک عرصے سے ان لڑکیوں کا پیچھا کر رہے ہو۔ ان پر آوازے کستے ہو۔ اشارے بھی کرتے ہو لیکن انہوں نے کبھی تمہاری بے عزتی

نہیں کی۔ جانتے ہو کیوں؟"

ایک نے کہا۔ "میں جانتا ہوں......... یہ ہم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتیں۔"

دوسرے نے اس کے سر پر چپت مار کر کہا۔ "ابے نہیں۔ یہ ہم سے ڈرتی ہیں........."

"ڈر کس بات کا؟" آصف نے کہا۔ "یہ چاہیں تو اپنی پرنسپل سے، اپنے والدین سے شکایت کر سکتی ہیں، ہمارے خلاف پولیس کی مدد حاصل کر سکتی ہیں، ہمیں کوڑوں کی سزا دلوا سکتی ہیں مگر یہ ایسا نہیں کرتیں آخر کیوں؟"

"واقعی سوچنے کی بات ہے آخر کیوں؟"

آصف نے کہا۔ "اس لئے کہ ان کی زبان "اونہہ" کہتی ہے مگر دل "ہائے" کہتا ہے۔ یہ آنکھ اٹھا کر گھورتی ہیں اور نظریں جھکا کر شرماتی بھی ہیں۔ یارو! یہ جو کاجل لگاتی ہیں ناں، یہ بینائی کے بڑھانے کے لئے نہیں، ہمیں آگے بڑھانے کے لیے لگاتی ہیں، ہمیں للچانے کے لئے ہونٹوں پر لالی لگاتی ہیں۔ دیکھو ہم فولاد ہیں فولاد۔ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ اگر کوئی مقناطیس بن کر ہمیں اپنی طرف کھینچ لے تو قصور ہمارا ہو گا یا مقناطیس کا؟"

"مقناطیس کا........." سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

تمام لڑکیاں دکان سے نکل کر ایک سمت جانے لگیں آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑ گئیں۔ نوجوانوں نے اپنی اپنی گاڑیاں سنبھالیں۔ جب وہ اس گلی میں پہنچے تو لڑکیاں دوسری گلی میں مڑ گئی تھیں۔ اس گلی میں ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مکان تھا۔ بابرا تالا کھول کر اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے لڑکیاں آتی ہوئی بولیں۔ "واہ۔ مکان تو بہت خوبصورت ہے تمہاری امی اور ابا کہاں ہیں؟"

"وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

"اوہ۔ تو تم یہاں تنہا رہتی ہو؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ چلو جلدی جلدی سے میز پر کھانے کی چیزیں رکھو۔ آسمہ، فریدہ تم کچن میں جا کر پلیٹیں لے آؤ۔ سلمیٰ تم چائے تیار کرو گی، ٹھیک ہے؟"

تمام لڑکیاں مصروف ہو گئیں۔ کوئی کھڑکی کھول کر پردہ درست کرنے لگی۔ کسی نے چھت کے پنکھے کو آن کیا۔ کوئی میز پر پلیٹیں لگانے لگی۔ بابرا نے بڑے سے کیک پر تین موم بتیاں لگا دیں ایک لڑکی نے پوچھا۔ "یہ تین موم بتیوں کا مطلب کیا ہوا؟"

"مطلب یہ کہ میں اس گھر میں تین برس گزار چکی ہوں۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی تمام لڑکیاں بابرا کو دیکھنے لگیں وہ بولی۔

"ٹھہرو.......... میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" آصف کی آواز سنائی دی۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود ہی آگیا ہوں۔" وہ مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ اٹھائے کمرے میں آگیا۔

ایک لڑکی نے حیران ہو کر کہا۔ "ارے! یہ تو سچ مچ آگیا۔"

آصف نے کہا۔ "یہ سوچ کر آگیا کہ اکیلا ہوں۔ اب یہ کوئی انصاف نہ ہو گا کہ تم سب مل کر مجھ اکیلے پر ہاتھ اٹھاؤ۔"

بابرا نے کہا۔ "میں انصاف کروں گی۔ جاؤ اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لاؤ۔"

آصف نے پوچھا۔ "یعنی کہ سب کے ساتھ انصاف ہو گا؟ آپ تو بہت سوئیٹ ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ.........."

وہ آگے بڑھا بابرا پیچھے ہٹ گئی وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ واپس آکر جی چاہے گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ ایک لڑکی نے بابرا سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ وہ اتنی باتیں کہہ گیا اور تم چپ کھڑی ہو۔"

"میں ایک ہی بار بولوں گی۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "تم نے انصاف کے لئے پوری فوج کو بلایا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے انصاف کرنا شروع کر دیں۔"

ایک اور لڑکی نے کہا۔ "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

آصف کے پیچھے دوسرے نوجوان آنے لگے ایک نے کہا۔ "ہمیں بھی ڈر لگ رہا ہے۔ ایمان سے ہم آئے نہیں' لائے گئے ہیں۔"

بابرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ آپ راستے میں چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے نہیں ڈرتے اور جب گھر کی چار دیواری میں دل کی بات کہنے کا موقع آئے تو ڈرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ سب ادھر بیٹھ جائیں۔"

وہ لوگ ایک طرف صوفوں پر بیٹھ گئے۔ آصف نے لڑکیوں سے کہا۔ "تم سب ادھر بیٹھ جاؤ۔"

وہ سب دوسری طرف صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ بابرا نے لڑکوں سے پوچھا۔ "کیا محبت کرنا جرم ہے؟"

"بالکل نہیں.........." سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔

آصف نے لڑکیوں سے کہا۔ "ہم سے پہلے بھی یہ دنیا والے محبت کرتے آئے ہیں۔"

بابرا نے لڑکوں سے کہا۔ "ہمارے ماں باپ نے' ہمارے بزرگوں نے بھی اپنی جوانی میں عشق کیا ہو گا۔"

"کیا ہو گا نہیں' کیا تھا۔ ان کے عشق نے ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"جب محبت ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی اور یہ جرم نہیں تو پھر ڈرنا کیسا؟"

آصف نے کہا۔ "ہاں جرم اس وقت ہے جب تالی دونوں ہاتھ سے نہ بجے یعنی لڑکی راضی نہ ہو۔"

بابرا لڑکوں سے بولی۔ "اور لڑکا اسے راہ چلتے چھیڑ کر پریشان بھی کرے اور بدنام بھی کرے۔ جانتے ہیں اس طرح کیا ہوتا ہے؟ آپ اس طرح دوسروں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ بھی آپ کی بہنوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کریں.........."

وہ سب جھینپ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بابرا نے کہا۔ "جھینپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کو اپنے گھر میں موقع دے رہی ہوں تاکہ آپ اپنی محبت کو سرِ عام تماشہ نہ بنائیں۔ یہاں آگے بڑھیں جسے آپ چاہتے ہیں اس کے کان میں پوچھیں۔ "ڈو یو لو می؟"

آصف نے لڑکیوں سے کہا۔ "جسے منظور ہو وہ مسکرا دے ورنہ کہہ دے۔ ابھی تو میں نادان ہوں۔"

سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "مسٹر آصف! پہلے آپ بابرا سے پوچھیں۔ ابتدا آپ دونوں سے ہو گی۔"

آصف اور بابرا نے ایک دوسرے کو سنجیدگی سے مگر محبت سے دیکھا' وہ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے قریب آئے پھر مسکرا کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ بابرا نے کہا۔ "ہم نے محبت کی منزل کو پالیا ہے یہ میرے سرتاج ہیں۔"

آصف نے اسے قریب کھینچ کر کہا۔ "اور یہ میری زندگی ہے۔ شریکِ زندگی.........."

سب کے سب حیرانی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "ہائیں' سرتاج' شریکِ زندگی۔ یعنی کہ صرف محبت ہی نہیں ہوئی شادی بھی ہو گئی؟"

ایک بولی۔ "اچھا تو ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا تھا؟"

ایک بولا........ ”نہیں........ یہ دونوں ابھی تک ہم سے مذاق کررہے ہیں........“

وہ دونوں میز کے دوسری طرف کیک کے پاس آکر کھڑے ہوگئے وہاں تین موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ آصف نے بابرا کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مذاق نہیں ہے۔ آج ہماری شادی کی تیسری سالگرہ ہے۔“

”تیسری سالگرہ؟“ سب نے مزید حیرانی کا اظہار کیا۔

بابرا نے کہا۔ ”ہاں۔ میرا اور آصف کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے جب کوئی خوشی کا موقع آتا ہے تو ہم اُداس ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم خوش ہوں تو دوسرے لوگ ہماری خوشیوں کو دیکھیں اور ہماری ازدواجی زندگی پر رشک کریں۔“

آصف نے کہا۔ ”اس لئے ہم نے سوچا اپنی خوشیوں میں آپ کو شریک کریں۔ آپ جو محبت تو کرتے ہیں مگر محبت کے اظہار سے ڈرتے ہیں آج ہم اپنی شادی کی تیسری سالگرہ کی خوشی میں آپ کو یہاں بلا کر یہ سنہرا موقع دے رہے ہیں۔ تم میں ہمت ہے تو آگے بڑھو اور محبت کرلو۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو۔“

ایک نوجوان نے کہا۔ ”بھئی موقع تو خوب دیا........ دل خوش کردیا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”مگر ایک ظلم کیا ہے ہمیں دھوکا دے کر یہاں لے آئے۔ ہم کوئی تحفہ نہ لاسکے۔“

آصف نے کہا۔ ”آپ لوگوں نے کھانے پینے کا اتنا سامان لاکر اپنا اپنا حق ادا کردیا ہے۔ گویا ہم آپ کی طرف سے تحفے وصول کرچکے ہیں۔“

اس دوران بابرا موم بتیاں روشن کرچکی تھی۔ اس نے اور آصف نے پھونک مار کر موم بتیاں بجھائیں۔ پھر دونوں ایک چاقو تھام کر کیک کاٹنے لگے۔ تالیوں کے شور میں مبارک باد کی آوازیں گونجنے لگیں اس کے ساتھ ریکارڈ پلیئر سے موسیقی کی آواز اُبھرنے لگی۔ موسیقی کی تال پر نوجوان جوڑے اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ اِدھر اُدھر رازدارانہ سرگوشیاں بہکنے اور بھٹکنے لگیں۔

”ڈو یُو لَو می........؟“

”نہیں نہیں........ ابھی نہیں، ابھی تو میں نادان ہوں۔“

”ڈو یُو لَو می........؟“

”ذرا دیکھو گی، ذرا سمجھوں گی، پھرہاں کہوں گی۔“

”ڈو یُو لَو می........؟“

”ہاں، ناں۔ ہاں۔ ناں۔ ہائے میں کیا کہوں۔“

رازدارانہ سرگوشیوں کے باعث ماحول بڑا رومان پرور ہوگیا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت سی دنیا آباد ہوگئی تھی، جہاں پیار کرنے والے کسی کو پتھر مار کر اشارے نہیں کرتے۔ ہر مرد اور ہر عورت کے دل میں کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی آرزو ہوتی ہے۔ وہاں ایسی آرزوؤں کی تکمیل ہو رہی تھی اگر ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھ کر انکار کرنے یا اقرار کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ باہمی سمجھوتے کی راہیں ہموار کی جائیں تو کسی کنواری کا آنچل میلا نہ ہو اور کوئی دل والا راہ چلتے کسی کو چھیڑ کر کوڑوں کی سزا تک نہ پہنچے۔ کیونکہ کوڑے محبت کی نہیں، گناہ کی پیٹھ پر لگائے جاتے ہیں۔

☆=========☆=========☆

رات جارہی تھی۔ خواب گاہ میں زیرو پاور کا بلب اونگھ رہا تھا آصف اور بابرا آرام دہ بستر پر ایک دوسرے کی آغوش میں سو رہے تھے۔ جہاں دو بدن کی طرح دو دل بھی ہم مزاج ہو کر ملتے ہوں، وہاں گہری نیند آتی ہے۔ ابھی ان کے درمیان ظالم سماج کی یا ظالم حالات کی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تقدیر مہربان تھی اور جب تقدیر مہربان ہو، تو انسان کو تھپک تھپک کر آرام سے سلاتی رہتی ہے۔

پھر اچانک یوں لگا۔ جیسے تقدیر نے ہولے ہولے رونا شروع کردیا ہو۔ بابرا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چند لمحوں تک جوں کی توں پڑی رہی۔ کچھ پریشان سی ہو کر وہ آواز سننے لگی سچ مچ رونے کی آواز تھی۔ کوئی بچہ رو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے آصف کے ہاتھ کو اپنے بدن پر سے ہٹایا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت سے بچے کی تصویر آویزاں تھی۔

بچہ اب زور زور سے رو رہا تھا۔ وہ بستر سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خواب گاہ سے باہر آگئی۔ وہاں ایک شوکیس میں بچوں کے بہت سے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بچہ اس کے اندر کہیں رو رہا ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے، پریشانی کے عالم میں مکان سے باہر آگئی۔ پھر نیم تاریکی میں ایک سمت بڑھنے لگی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رونے کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔

پھر وہ ایک مکان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اندر سے ایک بچے کے رونے کی آواز

مسلسل آ رہی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی اب اندر سے گھنٹی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ دو چار بار گھنٹی بجانے کے بعد کسی مرد کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ ”کیا مصیبت ہے۔ آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔ دو بجے رات کو ملنے چلے آتے ہیں۔“

دروازہ کھل گیا۔ بچے کے رونے کی آواز اور زیادہ واضح ہو گئی۔ دروازہ کھولنے والے ادھیڑ عمر کے آدمی نے آنکھیں ملتے ہوئے بابرا کو دیکھ کر کہا۔ ”اچھا۔ تو پڑوسن صاحبہ ہیں۔ کیا آپ صبح ملاقات نہیں کر سکتی تھیں؟“

بابرا نے کہا۔ ”جی ہاں۔ مگر وہ آپ کا بچہ رو رہا ہے۔“

”ہاں۔ رو تو رہا ہے مگر آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بچہ بلک رہا ہے۔ اسے دودھ ہی پلا دیں۔“

”دودھ پلا دوں۔ یعنی کہ میں' یہ کیا مذاق ہے۔ دودھ اس کی ماں پلائے گی۔“

”تو آپ اس کی ماں کو نیند سے بیدار کریں۔“

”ایں۔ نیند سے جگاؤں؟ اگر وہ ناراض ہو کر میکے چلی جائے گی تو کیا میرا گھر برباد کر کے آپ کو خوشی ہو گی؟“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔ بچہ بھوک سے روتا رہے گا اور آپ اپنی بیوی کی نیند میں خلل پیدا کر کے اسے ناراض نہیں کریں گے۔“

”نہیں کروں گا۔ وہ میرا بچہ ہے۔ اسے بھی رفتہ رفتہ میری طرح صبر کرنے کی عادت ہو جائے گی۔ بس آپ جائیں۔ ہماری نیند خراب نہ کریں۔“

وہ دروازہ بند کرنے لگا۔ بابرا نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ٹھہریئے۔ آپ اپنی بیوی کو ناراض نہ کریں۔ میں جا کر جگا دیتی ہوں۔“

”آپ۔ آپ اتنی رات کو میرے گھر میں آئیں گی۔ میری گھر والی نے دیکھ لیا تو.......... تو معاف کیجئے گا۔ میری آبرو صرف میری بیوی کے لئے ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے دروازہ ایک دھڑاکے سے بند کر دیا۔ اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟ اوہو' ہو' میرا منا رو رہا ہے۔ میں اپنے راجہ بیٹے کو ابھی دودھ پلاؤں گی۔ اوہو' ہو' باہر کون ہے؟“

بابرا مطمئن ہو کر وہاں سے واپس جانے لگی۔ مرد کی آواز سنائی دی۔ ”کوئی نہیں۔ میں ہوں بیگم۔ باہر کا دروازہ بند کر رہا ہوں۔“

”اتنی رات کو دروازہ کیوں کھولا تھا؟“

”وہ.......... بات یہ ہے بیگم کہ.......... کہ ایک بھکاری آیا تھا۔ میں نے اسے بھگا دیا۔“

”آیا تھا یا آئی تھی؟ جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ اتنی رات کو کوئی بھیک مانگنے آتا ہے یا بھیک دینے آتی ہے؟“

بابرا تیزی سے چلتی ہوئی اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہوئی.......... آصف دونوں ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اب پڑوسن کے مکان سے لڑنے جھگڑنے اور چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بابرا برآمدے کے سرے پر بیٹھ گئی۔ آصف نے کہا۔ ”کسی سے ہمدردی کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔“

”میں کیا کروں۔ وہ معصوم بچہ جانے کتنی دیر سے رو رہا تھا۔“

”تو کیا ہوا؟“

بابرا نے سر اٹھا کر آصف کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اس کے ساتھ ہی بابرا کی آنکھیں بھیگ گئیں' وہ بولی۔ ”میرے اندر بھی کوئی رو رہا تھا۔“

آصف نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ پھر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ کو محبت سے تھام کر بولا۔ ”ابھی تو ہماری شادی کو صرف تین سال ہوئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی تمہاری آرزو پوری ہو گی..........“

”اللہ کب چاہے گا؟“

کون جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سی بات کب منظور ہوتی ہے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”لیڈی ڈاکٹر نے تو کہا ہے کہ تم ماں بن سکتی ہو۔“

”تم بھی تو باپ بن سکتے ہو۔“

”ہاں' مگر میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کسی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرا لوں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ میں کوئی خرابی ہو؟“

”خدا نہ کرے کہ کوئی خرابی ہو' تم کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جانا۔“

”کیوں نہ جاؤں؟“

”بس' یوں ہی۔“

”نہیں' تمہارے اعتراض کی کوئی وجہ تو ہو گی؟“

”میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے سوچتی تھی کہ شاید میں بانجھ ہوں' کبھی

ماں نہیں بن سکوں گی، کسی طرح صبر کرلیتی تھی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ میں ماں بن سکتی ہوں، صبر نہیں ہوتا۔ ہر دم یہی بے چینی سی رہتی ہے کہ کب وہ مبارک گھڑی آئے گی؟"

"ہاں بوبی، یہ یقین ہو جائے کہ منزل ملے گی اور پھر بھی منزل سامنے نہ آئے تو صبر نہیں ہوتا، دل کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔"

بابرا نے کہا۔ "لیکن پھر بھی یقین رہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی تو منزل ملے گی خدا نہ کرے ڈاکٹر نے اگر کہہ دیا کہ آپ باپ نہیں بن سکتے تو رہا سہا یقین بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

"ڈاکٹر تو وہی کہے گا جو سچ ہو گا۔ کیا سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے؟"

"حوصلے کی بات نہیں ہے آصف! بہت سے لوگ امید پر زندہ رہتے ہیں۔ تم ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کراؤ گے تو ہمارے درمیان امید کی کرن ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔"

"یہ تو خود کو دھوکا دینا ہوا۔"

"کبھی کبھی خود کو دھوکا دے کر جینے کا حوصلہ پیدا کیا جاتا ہے مجھے اسی طرح جینے دو آصف!"

اس نے اپنا سر آصف کے شانے پر رکھ دیا۔ آصف گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ واقعی زمین زرخیز ہے۔ کسی موسم میں بھی فصل اگائی جا سکتی ہے بشرطیکہ کسان کے پاس جو بیج ہیں، ان میں پھلنے پھولنے کی صلاحیت ہو۔ ٹھیک ہے کہ زمین اپنے بیج کا طبی معائنہ نہیں چاہتی لیکن کسان کو اپنی خوبیوں اور خامیوں سے باخبر رہنا چاہئے۔

بابرا نے پوچھا۔ "آپ کیا سوچنے لگے؟"

"بوبی! اللہ جو کرتا ہے، اچھائی کے لئے کرتا ہے۔ شاید ہم اس لئے ابھی بچے سے محروم ہیں کہ تم تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ یہ تمہارا آخری سال ہے تم دیکھنا اِدھر تمہارے فائنل ایئر کا شاندار رزلٹ نکلے گا اُدھر تم شاندار ننھا منا سا رزلٹ آؤٹ کرو گی۔"

وہ مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔ "کل سے کالج میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ آج ہماری سالگرہ کی پارٹی میں جو لڑکیاں شریک ہو کر گئی ہیں، وہ سارے کالج میں مشہور کر دیں گی کہ میری شادی ہو چکی ہے۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ شادی کی بات نہ چھپاؤ۔"

"آپ نہیں جانتے۔ اگر کالج میں یہ خبر پھیل جائے کہ کسی لڑکی کی شادی ہو چکی

ہے تو ساری لڑکیاں اس کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ میاں بیوی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنا شروع کر دیتی ہیں۔"

"اچھا، تو اب لڑکیاں تم سے بھی پوچھا کریں گی؟"

"اور نہیں تو کیا........ بڑی راز داری سے پوچھتی ہیں۔"

"کیا پوچھتی ہیں؟"

"ساری لڑکیوں کو ایک ہی فکر ستاتی ہے کہ سہاگ رات میں دولہا کیسے ستاتا ہے؟"

"تم کیا جواب دو گی؟"

"میں کہوں گی........ میری سہاگ رات کو تین برس گزر چکے ہیں میں ساری باتیں بھول چکی ہوں۔"

"ارے۔ ایسا بھی کیا بھولنا؟ چلو ابھی رات باقی ہے۔ میں تمہیں یاد دلاؤں گا۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ شرماتی ہوئی اس کی آغوش میں پہنچ گئی۔ سہاگ رات عورت کی زندگی کی سب سے اہم اور یادگار رات ہوتی ہے عورت اسے یاد کر کے بڑھاپے میں بھی شرماتی ہے۔

☆=========☆=========☆

مکان کے احاطے میں آصف اپنے اسکوٹر کی صفائی کر رہا تھا اس سے کچھ فاصلے پر مالی باغیچے میں ایک پودا لگا رہا تھا۔ آصف نے مکان کی طرف گھوم کر آواز دی۔ "بوبی! کہاں ہو؟ ہری اپ تمہارے کالج کا وقت ہو گیا ہے۔"

اندر سے آواز آئی۔ "بس ابھی آئی........ جسٹ اے منٹ........"

آصف انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لئے ٹہلتے ہوئے رنگ برنگے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک سُوکھے ہوئے پودے کو دیکھ کر پوچھا۔ "مالی! یہ پودا تو مرجھا گیا ہے میں نے کبھی اس میں پھول کھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"صاحب! بیج اگر ناکارہ ہو تو پودے ایسے ہی مرجھا جاتے ہیں اور ایک پھول بھی نہیں کھلتا۔"

مالی کے جواب نے آصف کو چونکا دیا۔ اس نے پوچھا۔ "تو پھر پھول کیسے کھلے گا؟"

"صاحب! بیج بدلنا ہو گا؟"

آصف نے پلٹ کر دیکھا۔ بابرا باہر آکر دروازے پر تالا لگا رہی تھی اس نے پوچھا۔

"کیا پھولوں کا معائنہ ہو رہا ہے؟"

آصف نے کہا۔ "ہاں۔ زمین کا یہ حصہ خالی ہے' یہاں پھول نہیں کھل رہے ہیں۔"

وہ قریب آتی ہوئی بولی۔ "کیا ہوا کھل جائیں گے۔"

آصف نے کہا۔ "مالی کا کہنا ہے کہ دوبارہ زمین ہموار کرکے دوسرا بیج ڈالا جائے۔ اس کے بعد پھول کھلیں گے۔"

وہ بولی۔ "ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ مالی کو پہلے ہی بیج بدل دینا چاہئے تھا۔"

وہ کہتے کہتے ٹھٹک گئی۔ کبھی مرجھائے پودوں کو اور کبھی آصف کو دیکھنے لگی پھر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مالی! یہ پودا ایسے ہی رہے گا' بیج بدلا نہیں جائے گا زمینیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے پودے کے قدموں سے لپٹی رہتی ہیں خواہ پھول کھلے یا نہ کھلے.........."

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اسکوٹر کے پاس آگئی آصف بھی خاموشی سے اسکوٹر پر آکر بیٹھ گیا پھر وہ اسکوٹر آگے بڑھ گیا۔ راستے میں بابرا نے پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"تم بھی تو چپ ہو۔"

"میں سوچ رہی ہوں۔ میں ہی اب تک ماں بننے کی آرزو کر رہی تھی یہ بھول گئی تھی کہ آپ بھی باپ بننے کے لئے اندر ہی اندر تڑپ رہے ہیں' ایک مشورہ دوں؟"

"میں سن رہا ہوں۔"

"شاید ہمارے ستارے آپس میں نہیں ملتے اگر آپ دوسری شادی کرلیں تو باپ بننے کی خواہش پوری ہو جائے۔"

"سچ پوچھو تو یہی مشورہ میں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔"

"فضول باتیں نہ کریں۔"

"سچ کہتا ہوں۔ میری جگہ کوئی دوسرا شوہر ہوتا تو تم تین برس میں تین بچوں کی ماں بن جاتیں۔"

"گاڑی روکیں۔"

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی وہ غصہ سے بولی۔ "گاڑی روکیں۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔"

"ناراض کیوں ہو رہی ہو.......... میں نے گالی تو نہیں دی ہے۔"

"آپ نے گالی دی ہے۔ گاڑی روکئے' نہیں تو چیخنا شروع کر دوں گی۔"

اس نے گاڑی روک دی۔ وہ گاڑی سے اتر کر بولی۔ "آپ کو شرم نہیں آتی۔ اپنی بیوی کو دوسری شادی کا مشورہ دے رہے ہیں؟"

"پہلے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ پہلے تم نے مشورہ دیا تھا۔"

"اولاد نہ ہو تو مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔"

"اور دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہو تو؟"

"ضرور ہوگی۔" وہ منہ پھیر کر دل پر جبر کرتی ہوئی بولی۔ "آپ دوسری شادی کرلیں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اگر تمہاری ناراضگی اسی طرح دور ہو سکتی ہے تو یہی سہی۔ کیا تم اپنے سوتیلے بچے کو گود میں کھلاؤ گی؟"

بابرا نے پلٹ کر اسے سنجیدگی سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے بازو کو محبت سے تھام کر بولی۔ "میں جو ایک بچے کی آرزو کرتی ہوں تو میرے خوابوں اور خیالوں میں وہ آپ ہی کا بچہ ہوتا ہے۔ میں صرف اسی بچے کو سینے سے لگاؤں گی' جو آپ کا ہوگا۔ خواہ وہ مجھ سے ہو یا میری سوکن سے.........."

وہ ہاتھ بڑھا کر بولا.......... "اچھا تو وعدہ؟"

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی.......... "وعدہ.........."

"چلو اب گاڑی پر بیٹھ جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر سڑک پر دوڑنے لگی۔ آصف عقب نما آئینہ میں بابرا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اداسی سے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹی ہوئی باتیں اسے سمجھا رہا تھا۔ "یہ مرد کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آصف میرے سوا کسی دوسری لڑکی کا تصور بھی کر سکتے ہیں مگر دیکھو تو کتنی جلدی دوسری شادی کے لئے راضی ہوگئے ہیں۔ جیسے پہلے سے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ میری طرف سے اجازت ملتے ہی مجھ سے پکا وعدہ لے لیا.........."

شام کو اس خیال کی تصدیق ہوگئی۔ وہ کچن میں مصروف تھی کہ ڈرائنگ روم سے آصف کی آواز سنائی دی۔ "بوبی! تم کہاں ہو؟ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے.......... دوسری گھروالی لے آیا ہوں۔"

"دوسری گھروالی؟" بابرا نے پریشان ہو کر دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتی ہوئی کچن سے باہر آئی ڈرائنگ روم میں آصف کے ساتھ ایک لڑکی سرخ جوڑا پہنے'

گھونگھٹ نکالے اور سر جھکائے کھڑی تھی۔ ان کے آس پاس آصف کے دو چار دوست بھی تھے۔

بابرا ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ٹھٹک گئی تھی۔ آصف کے ایک دوست نے کہا۔

''بھابی! خدا آپ جیسی بیوی سب کو نصیب کرے آپ نے کتنی فراخدلی سے آصف کو دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔ اب اس خوشی کے موقع پر ایک شاندار پارٹی ہونی چاہئے۔''

آصف نے کہا۔ ''کل ولیمہ کی دعوت ہوگی' ہاں بوبی! اس خوشی میں تم' سب لوگوں کو چائے پلا دو' تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے اجازت دو۔ میں ذرا دوسری والی کے ساتھ مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ او کے۔ گڈ بائی.........''

وہ نئی دلہن کو سہارا دے کر خواب گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ بابرا تیزی سے آگے بڑھی۔ پھر خواب گاہ کے دروازے پر راستہ روکتی ہوئی بولی۔ ''خبردار! یہ میرا کمرہ ہے یہاں کوئی دوسری قدم رکھے گی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔''

آصف نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ارے تو کیا تمہارا وعدہ جھوٹا تھا؟''

''آپ نے بھی تو شادی کی رات وعدہ کیا تھا کہ میرے سوا کسی دوسری کا منہ نہیں دیکھیں گے۔''

''یقین کرو بوبی! میں نے اس گھونگھٹ والی کا منہ بھی نہیں دیکھا ہے۔ تمہاری اجازت سے ہی دیکھنے یہاں لایا ہوں اور تم تو اجازت دے چکی ہو.........''

''ہاں اجازت دے چکی ہوں مگر اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی.........''

وہ غصہ سے طنطناتی ہوئی جانے لگی۔ آصف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ ''بھئی' سنو تو یہ دوسری والی ہمیشہ یہاں نہیں رہے گی۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''یہ ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہے گی جہاں سے بیاہ کر لائے ہیں' اسے وہیں لے جائیں۔''

''وہاں والے اسے واپس نہیں لیں گے۔ ہاں اگر ایک سال کے اندر ہمارے گھر میں ایک ننھے منے سے بچے کا اضافہ نہیں کرے گی تو واپس کر دی جائے گی۔''

''کیا مطلب؟'' بابرا نے حیرانی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ تمہیں ایک بچے کی ضرورت ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ بچہ میرا ہی ہو اس لئے میں اسے پورے ایک سو ایک روپے میں خرید کر لایا ہوں.........''

''خرید کر لائے ہیں؟'' وہ مزید حیرانی سے بولی۔ ''کہاں سے؟''

''ایک فیکٹری سے۔ فیکٹری والوں نے ایک سال کی گارنٹی دی ہے۔ بچہ ضرور ہوگا۔''

وہ جھلا کر بولی۔ ''آپ سیدھی طرح نہیں بتائیں گے۔ میں اسی حرام زادی سے پوچھوں گی۔''

اس نے آگے بڑھ کر دلہن کے گھونگھٹ کو نوچ لیا۔ گھونگھٹ کے پیچھے ایک ہیجڑا نظر آیا۔ وہ تالی پیٹ کر بولا۔ ''اے بی بی! سوکن سے ایسا بھی کیا جلنا؟ تجھے ہمارے ہونے والے بچہ کا واسطہ' میرے سہرے کے پھول تو کھلنے دے۔''

بابرا نے تڑاخ سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ دوسری طرف گھوم لیا۔ پھر وہ آصف کی طرف بڑھی۔ ''اچھا' تو تم میرا مذاق اڑا رہے تھے؟''

آصف پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''دیکھو پہلے میری بات سنو.........''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔''

وہ پھر آگے بڑھی۔ ہیجڑا آصف کے آگے سینہ سپر ہو کر بولا۔ ''اے بی بی! کیا مجھے بیوہ بنانا چاہتی ہے؟ قسم ہے مجھے اپنے سہاگ کی' میں اپنے شوہر کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ.........''

تڑاخ سے پھر ایک طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ آصف کے دوسرے دوست بیچ بچاؤ کے لئے دوڑے آئے تو بابرا نے ان پر بھی بلی کی طرح پنجے مارے۔ ''میں تم لوگوں کو ایسی شاندار پارٹی دوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔''

وہ ایک گلدان اٹھا کر مارنے کے لئے دوڑی۔ آصف اسے پکڑ کر کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ''کیا پاگل ہوگئی ہو؟''

''چھوڑ دیجئے مجھے۔ میں آپ کو غصہ نہیں دکھا سکتی ان لوگوں پر تو غصہ اتار سکتی ہوں۔''

آصف نے دوستوں سے کہا۔ ''ڈرنے کی بات نہیں آرام سے بیٹھو میں ابھی چائے پلاؤں گا۔ بس ایک منٹ.........''

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا' وہ بولی۔ ''دروازہ کھولئے۔''

''کیا تمہیں اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ میں نے سچ مچ شادی نہیں کی۔ محض مذاق کیا ہے؟''

"آپ نے مذاق نہیں کیا ہے میرا مذاق اڑا رہے ہیں کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"

"نہیں.......... میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ عورت جتنی فراخ دلی سے دوسری شادی کی اجازت دیتی ہے۔ اتنی فراخ دلی سے اپنی سوکن کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اس لئے کہ میں اپنے پیار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتی۔"

"تو کیا میں ہیجڑے کو شریک کرتا ہوں؟"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ آصف نے کہا۔ "ہنسی تو پھنسی.........." یہ کہہ کر اس نے بوبی کو آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کے چہرے پر.......... جھکنے لگا..........

ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دوست جمائیاں لینے لگے ایک نے کہا۔ "پتہ نہیں چائے کب آئے گی؟"

دوسرے نے کہا۔ "بھئی چائے ابھی گرم ہو رہی ہے۔"

ہیجڑے نے تالی پیٹ کر کہا۔ "اے۔ وہ تو بہت ہی گرم تھی۔ آصف میاں ٹھنڈی کر رہے ہیں۔"

☆==========☆==========☆

ہسپتال کے ایک وارڈ میں مختلف مریضوں کے بستروں کے اطراف بہت سے عیادت کرنے والے رشتے دار جمع تھے۔ آصف بھی ایک مریض کی عیادت کے لئے آیا تھا اور اس سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ ایک وارڈ بوائے نے آکر پوچھا۔ "جناب! کیا آپ ہی آصف صاحب ہیں؟"

"ہاں.......... کیا بات ہے؟"

"جناب لیڈی ڈاکٹر کا حکم ہے کہ آپ ہسپتال سے باہر چلے جائیں۔"

"کیا مطلب؟ یعنی کہ میں کیوں چلا جاؤں؟"

"یہ میں نہیں جانتا.......... ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جسے وہ پسند نہیں کرتی ہیں اسے ہسپتال میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔"

"وہ ڈاکٹر ہے یا ہسپتال کی ملکۂ عالیہ؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس بدتمیزی کی وجہ معلوم کروں گا۔ چلو میرے ساتھ۔"

وہ وارڈ بوائے کو دھکا دے کر وارڈ سے باہر آیا وارڈ بوائے نے کہا۔ "صاحب! آپ مجھے کیوں غصہ دکھا رہے ہیں۔ وہ رہا ڈاکٹر صاحبہ کا کمرہ آپ ان سے جا کر پوچھ

لیں.........."

آصف غصہ سے طنطناتا ہوا کمرے داخل ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کی جانب پشت کئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ آصف نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے ہسپتال سے باہر جانے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے؟"

جواب ملا۔ "اس لئے کہ تم جھوٹے بے ایمان اور دغاباز ہو۔"

وہ غصے کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر! یہ الزامات ثابت کرو' ورنہ میں تمہیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔"

"مجھے اٹھا کر پھینکنے کے لئے قریب آنا ہو گا اور میں یہی چاہتی ہوں کہ تم کسی بہانے قریب آجاؤ۔"

وہ دونوں بانہیں پھیلا کر آصف کی طرف گھوم گئی وہ چونک کر بولا۔ "ارے انجمن تم۔ تم یہاں؟"

"ہاں۔ اسے محبت کی انتہا کہتے ہیں۔ کچے دھاگے سے بندھی ہوئی لاہور سے یہاں آگئی ہوں۔"

آصف نے پریشان ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے کے بعد کہا۔ "خدا کے لئے اب عشق و محبت کی باتیں نہ چھیڑو۔ میری بیوی بھی یہاں موجود ہے۔"

"بیوی سے اتنا ڈرتے ہو تو مجھ سے محبت کیوں کی تھی؟"

"بے شک میں شادی سے پہلے تمہیں پسند کرتا تھا اور شادی سے پہلے سینکڑوں لڑکیاں پسند آتی ہیں۔ اسے جوانی کی بھول بھی کہہ سکتی ہو' لیکن میں نے ایسی بھول نہیں کی جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ میں نے تمہاری خاطر اب تک شادی نہیں کی اور تمہاری ہی خاطر ٹرانسفر کرا کر یہاں آئی ہوں۔ میرے وحید بھائی جان بھی اسی ہسپتال میں ہیں.........."

دوسرے کمرے میں وحید ایک ڈاکٹر کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "جناب! آپ لوگوں کی مہربانیوں سے یہاں کے تمام مریض میری ہی دکان سے دوائیں خریدتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ آپ کی دکان ہسپتال کے احاطہ میں ہے مریضوں کو یہاں سے دوائیں خریدنے میں سہولت ہوتی ہے۔"

وحید ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے' مگر جب سے شراب اور دوسرے نشے پر

پابندی لگائی گئی ہے لوگ ڈر کے مارے مارفیا کا انجکشن خریدنے نہیں آتے ہیں اگر آپ دوا علاج کے طور پر اس انجکشن کو نسخہ میں لکھ دیا کریں تو.........."

ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔ "مسٹر وحید! میں ایک ذمے دار ڈاکٹر ہوں منشیات کا دلال نہیں ہوں۔ اگر آئندہ آپ نے ایسا مشورہ دیا تو میں آپ کا لائسنس کینسل کرا دوں گا۔"

"آ' آپ تو ناراض ہو گئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ.........."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بابرا ڈاکٹر کو مخاطب کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ "ڈاکٹر دس نمبر وارڈ کے ایک مریض کی حالت خراب ہے اور نرس اسے اٹینڈ نہیں کر رہی ہے پلیز! آپ اسے اٹینڈ کریں۔" ڈاکٹر فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت وحید نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو بوبی!"

بوبی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "وحید! تم۔ تم یہاں؟"

"شکر ہے کہ تم نے مجھے بھلایا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کمرے سے جا چکا تھا۔ بوبی وحید کو غصے سے دیکھتی ہوئے جانے لگی وہ راستہ روک کر بولا۔ "کیا ناراض ہو؟"

"تم سے ناراض ہونے یا خوش ہونے والا کوئی رشتہ نہیں ہے ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔"

وہ ایک طرف ہو کر بولا۔ "میں تو اس لئے روک رہا تھا کہ تمہاری ایک تصویر میرے پاس رہ گئی ہے۔"

وہ کمرے سے باہر جاتے جاتے ٹھٹک گئی۔ "کیسی تصویر؟"

"آرام سے بیٹھو۔ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو.......... میں یاد دلاتا ہوں۔"

بوبی نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وحید نے کہا۔ "میں اس تصویر کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتا ہوں' یہ دیکھو۔"

اس نے قمیض کی اوپری جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ بوبی نے اسے لے کر دیکھا۔ تصویر میں بوبی تھی۔ وحید نے اس کے ہاتھوں کو تھام رکھا تھا دونوں روبرو تھے اور ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

اس ایک تصویر سے یادوں کی البم کے اوراق کھلنے لگے ماضی کی کتنی ہی تصویریں نگاہوں کے سامنے آنے لگیں۔ انسان کو جوانی میں دو اہم دور آتے ہیں' ایک دور شادی سے پہلے دوسرا شادی کے بعد آتا ہے شادی سے پہلے لڑکیاں کتنے ہی لڑکوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ کیونکہ پسندیدگی کے دوران ہی خوب سے خوب تر جیون ساتھی ملتا ہے۔ وحید نے بوبی کو جب شریکِ حیات بنانے کا وعدہ کیا تو وہ وعدے کے فریب میں آ گئی۔

پہلے پہل وحید کے وعدے میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ سچ مچ اسے دل و جان سے چاہتا تھا جیسے جنگل میں مور ناچتا ہے ویسے ہی بوبی اس کے خیالوں کے جنگل میں ناچتی تھی لیکن جلد ہی ناچتے ہوئے مور اور مورنی کو اپنے بھدے پاؤں نظر آئے۔ بوبی غریب ماں کی بیٹی تھی بوڑھی ماں بڑی محنت و مشقت کے بعد تین وقت کی روٹی اور بیٹی کی تعلیم کے اخراجات پورے کرتی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر بوبی نے کہا۔ "وحید! مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا لو۔ میں بوڑھی ماں پر کب تک بوجھ بنی رہوں گی' شادی کے بعد تم چاہو گے تو میں اپنی تعلیم جاری رکھوں گی۔"

وحید کے سر پر اپنی بہن انجمن کی ذمے داریاں تھیں اس نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں انجمن کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں۔"

"تم اس کی شادی کر دو۔ وہ بھی سسرال میں جا کر پڑھ لے گی۔"

"شادی کے بعد تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن آصف دولت مند بھی ہے اور ذہین بھی۔ وہ انجمن کو شادی کے بعد پڑھا سکتا ہے۔"

"کیا شادی کی بات طے ہو گئی ہے؟"

"ابھی طے نہیں ہوئی لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اب آصف باقاعدہ انجمن کا رشتہ مانگنے میرے پاس آئے تو بات بنے گی۔"

بوبی نے کہا۔ "یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں کہ لڑکا یا لڑکے والے رشتہ مانگنے لڑکی کے گھر آیا کرتے تھے۔ یہ نیا دور ہے۔ انجمن کو خود آصف سے شادی کی بات چھیڑنا چاہئے۔"

"نہیں۔ یہ بے شرمی ہے۔ میری بہن ایسا نہیں کر سکتی۔"

"ہم اپنی شادی کی باتیں کر رہے ہیں کیا یہ بے شرمی نہیں ہے؟"

"ہماری بات دوسری ہے۔"

"ہاں! میں دوسری ہوں۔ میری جگہ تمہاری بہن ایسی باتیں کرے تو بے شرمی ہے اور میں کروں تو وہ عشق کہلائے گا۔"

"بھئی، تم تو بحث کرنے لگیں۔"

"تم تسلیم کرو کہ میں درست کہہ رہی ہوں پھر میں تمہاری مشکل آسان کر دوں گی۔"

"تم درست کہہ رہی ہو۔ چلو اب مشکل آسان کرو۔"

"مجھے آصف کا پتہ بتاؤ۔ میں اس سے انجمن کے رشتے کی بات کروں گی۔"

"تم کس رشتے سے انجمن کے رشتے کی بات کرو گی؟"

"دادی اماں بن کر جاؤں گی۔ کہوں گی میاں صاحبزادے! میں انجمن کی دادی ہوں دبئی سے آئی ہوں اگر تم دو دن کے اندر اس سے نکاح نہیں پڑھاؤ گے تو میں اسے 'لے کر دبئی چلی جاؤں گی۔"

وہ بوڑھی عورت کی لرزتی ہوئی آواز میں مکالمے ادا کر رہی تھی۔ وحید ہنس رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم انجمن کے رشتے کی بات کرنے آئی ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" بوبی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ میں پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ تم انجمن کی کون ہو؟"

"سہیلی۔" بوبی نے جواب دیا۔

"اوں ہونہہ......... میں نہیں مانتا کہ تم اس کی سہیلی ہو۔ تم نے اپنا نام بابرا بتایا ہے اور انجمن کی سہیلی کا نام بابرا نہیں ہے۔"

"وہ مجھے بوبی کہتی ہے۔"

"بوبی؟" آصف نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اچھا تو تم انجمن کی ہونے والی بھابی ہو؟"

بوبی نے شرما کر گردن جھکالی۔ آصف نے کہا۔ "تعجب ہے تم یہاں میری شادی کی بات کرنے آئی ہو اور اپنی شادی کے ذکر پر شرما رہی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی پھر اس نے کہا۔ "اگر آپ انجمن سے واقعی محبت کرتے ہیں تو پھر آپ کو جلد ہی شادی کی بات کرنا چاہئے۔"

"میں انجمن سے محبت نہیں کرتا۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ آپ محبت کرتے ہیں اسی لئے تو پسند کرتے ہیں نا؟"

"بھئی پسند تو بہت سے لوگ آتے ہیں تم بھی مجھے پسند آئی ہو۔"

"جی؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"جی ہاں......... دنیا کی ہر خوبصورتی پسند آتی ہے۔ کسی کو پسند کرنے کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں محبت کرنے کے لئے سُوجھ بُوجھ اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ حوصلہ نہ تو انجمن میں ہے نہ وحید میں........."

"آپ وحید کی توہین کر رہے ہیں۔"

"جب تم رشتے کی بات کرنے آئی ہو تو تمہیں برا نہیں ماننا چاہئے کیونکہ میں ہونے والے رشتوں میں جو اچھائی اور برائی دیکھوں گا' وہی کہوں گا۔"

"آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"یہی کہ وحید صاحب دولت مند بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ایک چچا صاحب نے انہیں آفر دی ہے کہ اگر وہ گھر داماد بن جائیں' تو انہیں کم از کم ایک لاکھ روپے کاروبار کے لیے دیئے جائیں گے اور انجمن کو تعلیم دلانے کے لئے ملک سے باہر بھیجا جائے گا۔"

"کیا آپ مجھے وحید کے خلاف بہکا رہے ہیں؟"

"نہیں۔ تم رشتے کی بات کرنے آئی ہو اس لئے جواباً کہہ رہا ہوں کہ میں نے انجمن سے شادی کے لئے کہا تھا لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال رہی ہے کہ بہت بڑی ڈاکٹر بننے کے بعد شادی کرے گی میں تین سال تک اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں تنہا ہوں اور مجھے ایک شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔"

"آپ صرف اپنی ضرورت دیکھ رہے ہیں کیا انجمن ڈاکٹر بنے گی تو آپ کو فخر حاصل نہیں ہو گا؟"

"وہ فخر تین سال بعد حاصل ہو گا۔ پھر تم ابھی رشتے کی بات کیوں کر رہی ہو؟"

"ایں........." وہ گڑبڑا گئی۔ کیونکہ انجمن کی شادی کے بعد ہی وحید اسے اپنی دلہن بنا سکتا تھا۔

"بوبی! انجمن مجھے اور وحید تمہیں ٹال رہا ہے۔ ہم دونوں شادی کے خواب ہی دیکھتے رہ جائیں گے۔"

وہ ناراضگی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے وحید پر بھروسہ ہے۔"

"میری دعا ہے کہ تمہارے بھروسے کی لاج رہے۔ ویسے میری بات درست ہو اور تمہارا دل ٹوٹ جائے تو مجھ سے ایک بار ضرور ملنا۔ میں تمہیں اپنی زندگی کا ایک یادگار مشورہ دوں گا۔"

وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ یعنی اس گھر سے منہ پھیر کر گئی جہاں اسے ایک دن دلہن بن کر آنا تھا۔ اس روز اٹھتے بیٹھتے آصف کی باتیں اس کے دماغ میں گونجتی رہیں کہ وحید کا دولت مند چچا اسے اپنا گھر داماد بنانا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وحید خود بھی دولت مند بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا وہ یقین نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شام کو وحید سے ملنے گئی تو انجمن نے کہا۔ "بھائی جان ابھی آئے تھے پھر چچا جان کے ہاں چلے گئے۔"

"انجمن! ایک بات پوچھوں؟"

"ایک نہیں ہزار باتیں پوچھو۔"

"کیا تمہارے چچا بہت دولت مند ہیں؟"

"ہاں۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "اتنے دولت مند ہیں کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجنے والے ہیں۔"

"سنا ہے کہ وہ تمہارے بھائی جان کو اپنا داماد بنانے والے ہیں۔"

انجمن نے مسکراتے ہوئے چہرے کا رنگ بدل لیا۔ وہ ناگواری سے بولی۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"ایک بار تم نے کہا تھا کہ آصف ایک اعلیٰ کردار کا مالک ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

"اچھا تو آصف نے تمہیں بہکایا ہے۔"

"اگر یہ جھوٹ ہے تو یقیناً اس نے بہکایا ہے اور وہ اعلیٰ کردار کا مالک نہیں ہے۔"

"تم آصف کی توہین کر رہی ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"تو پھر تسلیم کرو کہ آصف نے سچ کہا ہے۔"

"نہیں کہا ہے۔"

"تو پھر وہ جھوٹا ہے؟"

"نہیں ہے.........."

بوبی اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی.......... "میں عورت ہوں تمہاری مجبوریوں کو سمجھ گئی ہوں تم اپنے محبوب کی حمایت نہیں کر سکتیں اور بھائی کی

مخالفت میں بول نہیں سکتیں میں خود ہی تمہارے بھائی سے پوچھ لوں گی۔"

وہ بوجھل قدموں سے لوٹ گئی۔ وحید پر جو بھروسہ تھا' اس بھروسے کی زنجیر ٹوٹ رہی تھی انجمن کے گول مول سے جوابات نے یقین دلا دیا تھا کہ جس طرح دال میں کچھ کالا ہوتا ہے' اسی طرح وحید کے دل میں بھی کچھ کالا ہے۔

دوسرے دن پھر وحید کے مکان پر اس سے ملنے گئی تو وہاں دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ دونوں بھائی بہن مکان خالی کر کے کہیں چلے گئے ہیں۔ بوبی نے پوچھا۔ "کہاں گئے ہیں؟"

"پتہ نہیں جی۔ ان کا کوئی چچا ہے گلبرگ میں بہت بڑی کوٹھی ہے مگر میں پتہ نہیں جانتا۔"

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔

☆==========☆==========☆

وہ ایک باغیچے میں رنگ برنگے پھولوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی کہ آصف کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بوبی!"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آصف نے پوچھا۔ "کیا میرے سچ اور جھوٹ کا پتہ چل گیا؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "ابھی نہیں.........."

وہ بولا۔ "تمہارا تھکا ہوا لہجہ' اڑی ہوئی رنگت اور جھکی ہوئی نظریں بتا رہی ہیں کہ تم سچائی کو چھپا رہی ہو.........."

وہ سر جھکا کر جانے لگی آصف نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "اگر ساتھ چلتے چلتے کسی کا ساتھ چھوٹ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سفر ختم ہو گیا' نہیں بوبی! آگے بڑھنے کے لئے پہلے سے بہتر ہم سفر مل جاتے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ انجمن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ اب بھی آپ سے محبت کرتی ہے۔"

"ہاں۔ محبت کرتی ہے۔ شادی نہیں کرتی' پہلے ڈاکٹر بننا چاہتی ہے ایک بیمار کو ابھی دوا کی ضرورت ہے اور وہ تین سال کے بعد دوا دینا چاہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ بیمار زندہ کیسے رہے گا؟"

"اگر آپ کے دل میں محبت ہوگی تو ساری عمر اس کا انتظار کریں گے۔"

"یہ محبت نہیں حماقت ہوگی۔ شادی سے پہلے جو محبت ہوتی ہے وہ دراصل محبت نہیں ہوتی۔ محبت کی ریہرسل ہوتی ہے اس ریہرسل کے ذریعے ایک دوسرے کی اچھائی اور برائی کو سمجھنے کا سلیقہ آتا ہے۔"

"آپ نے کیا سلیقہ سیکھا ہے؟"

"یہی کہ جو محبت کی پہلی منزل میں ساتھ چھوڑ دے۔ وہ ہم سفر آخری منزل تک کبھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے یہی سلیقہ سیکھا ہے کہ آدمی جانور کی طرح اکیلا نہیں رہ سکتا اسے جینے کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری دنیا بہت خوبصورت ہے بوبی! ایک کا ساتھ چھوٹ جائے تو ہم دوسرا حسین ساتھی تلاش کرسکتے ہیں۔"

بوبی کے حسن پر آصف کی نظریں جم گئی تھیں وہ ہچکچاتی ہوئی جانے لگی اس نے کہا۔ "اگر تم اب بھی وحید کو تلاش کر رہی ہو تو میں تمہیں اس کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔"

بوبی نے چونک کر اسے دیکھا جیسے منزل تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو گیا ہو.........

☆=========☆=========☆

نائٹ کلب کے ماحول میں بڑی رنگینی تھی۔ مختلف میزوں کے اطراف نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی آواز دلوں میں اتر رہی تھی بوبی اور آصف ایک میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف نے بوبی سے کہا۔ "ادھر دیکھو۔ وحید صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

بوبی نے سر گھما کر دیکھا پھر ایک دم سے مایوس ہو گئی۔ وہ یقیناً وحید تھا مگر اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ اس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک جوان لڑکی کا ہاتھ تھا لڑکی کا لباس اور زیورات بتا رہے تھے کہ وہ کوئی رئیس زادی ہے۔ کلب کے بہت سے لوگ اس رئیس زادی کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وحید بھی ان لوگوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظریں بوبی پر پڑیں وہ ایک دم سے گھبرا گیا پریشان ہو کر رئیس زادی کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ رئیس زادی بوبی کو دیکھے یا ان کے تعلقات کو سمجھ سکے۔

اس نے رئیس زادی سے کہا۔ "ثمینہ! میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں صرف ایک منٹ میں.........."

ثمینہ مسکرا کر دوسروں سے باتیں کر رہی تھی اس نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بوبی اور آصف کی طرف آیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بوبی! تم یہاں کیسے آگئیں؟"

بوبی گم صم اسے دیکھ رہی تھی۔ آصف نے کہا۔ "وحید! تم پریشان نظر آرہے ہو بیٹھ جاؤ۔"

وحید نے پلٹ کر دور کھڑی ثمینہ کی جانب دیکھا پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بوبی! میں سمجھ رہا ہوں کہ تم ناراض ہو مگر میں، میں بہت مجبور ہو گیا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں اپنی بہن کو کتنا چاہتا ہوں اسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹ رہا ہوں۔"

آصف نے کہا۔ "بہت اچھے ڈائیلاگ ہیں لیکن انجمن کے تعلیمی اخراجات میں بھی برداشت کرنے کے لئے تیار تھا تم نے انکار کیوں کر دیا؟"

وحید نے ناگواری سے کہا۔ "کوئی غیرت مند بھائی اپنی بہن کے ہونے والے شوہر کا احسان نہیں لیتا۔"

"شادی کے بعد تو احسان نہ ہوتا۔ اپنی بیوی کی تعلیم مکمل کرانا میرا فرض ہوتا۔"

"شادی کے بعد لڑکیاں گھر گرہستی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ انجمن پہلے ڈاکٹر بنے گی پھر شادی کرے گی۔"

بوبی نے پوچھا۔ "کیا تمہاری دولت مند بیوی اسے ڈاکٹر بنائے گی؟"

"آں، تم، تم طعنہ دے رہی ہو؟"

"ایک غریب لڑکی اور کیا دے سکتی ہے آج معلوم ہوا کہ غریب اور زیادہ غریب اس لئے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ان کے حصے کی محبت بھی نہیں ملتی۔"

"بوبی! میں آج بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔ اب آصف صاحب کی باتیں سمجھ میں آرہی ہیں کہ ہم سب شادی سے پہلے محبت نہیں حماقت کرتے ہیں مرد اور عورت کی دوستی وہی بہتر ہوتی ہے، جو شادی کے بعد ہوتی ہے۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ثمینہ کی آواز آئی۔ وہ وحید کو آواز دیتی ہوئی آرہی تھی وحید فوراً ہی ثمینہ کی تعظیم کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سوری ثمینہ، مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ میں ابھی آنے والا ہی تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" ثمینہ نے بوبی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔"

وحید نے ہچکچاتے ہوئے بوبی کو دیکھا پھر جلدی سے بولا۔ "آں' ہاں' میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میری ان سے دوستی نہیں ہے۔"

"تو پھر ان کی تعریف؟"

"یہ میرے دوست آصف ہیں اور یہ......... آصف صاحب کی وائف ہیں.........."

بوبی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وائف' بیوی' آصف کی شریکِ حیات......... آصف کی محبت......... وہ چونک کر آصف کو دیکھنے لگی۔ وہ بھی مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا آرکسٹرا کی آواز بلند ہو گئی تھی اسٹیج پر مرد عورتیں ملی جلی آواز میں گا رہے تھے۔

"چھوڑو' چھوڑو اپنا دل نہ توڑو کوئی تمہیں ٹھکرائے' تم اسے ٹھکرا دو۔ اتنے بڑے جہاں میں اپنا جہاں بسا لو چھوڑو' چھوڑو اسے چھوڑو' چھوڑو۔"

بوبی ایک دم سے بکھر گئی تھی وہ بے تحاشہ وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔ کلب سے باہر آکر آصف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹھہرو۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری سچائی ثابت ہو جائے تو ایک بار تم میرے گھر آؤ گی پھر وہاں میں تمہیں ایک اہم مشورہ دوں گا' ایک یادگار مشورہ.........."

"مجھے کسی کا مشورہ نہیں چاہئے میں زندہ نہیں رہنا چاہتی......... مجھے جانے دو۔"

"تو پھر مرنے سے پہلے میری نیکیوں کا بدلہ چکا دو۔ آؤ ضد نہ کرو۔"

وہ اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔ بوبی اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی آصف نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ پیچھے بیٹھ گئی پہلے وہ الگ بیٹھی ہوئی تھی اسکوٹر ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوا تو وہ آصف سے ٹکرا گئی پھر جلدی سے الگ ہو گئی۔ گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑی جا رہی تھی بوبی کی نگاہوں کے سامنے آصف کی پہاڑ جیسی پشت تھی مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس سے آنکھیں چندھیا جاتیں تو وہ سہارے کے لئے اپنا ہاتھ آصف کے شانے کی طرف بڑھا دیتی پھر ہچکچا کر شانے تک پہنچنے سے پہلے ہٹا لیتی تھی۔

راستے کا موڑ ہو یا زندگی کا' ہر موڑ پر سنبھلنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آصف نے ایک موڑ پر اسکوٹر کو تیزی سے موڑا' تو اِدھر اُدھر سے گزرنے والی گاڑیوں کی چیخ و پکار اور ہیڈ لائیٹس کی روشنیوں سے گھبرا کر وہ بے اختیار آصف کی پشت سے لپٹ گئی۔

پھر اسے پتہ نہ چلا کہ ٹریفک کا طوفان کیسے گزر گیا؟ اور وہ کتنی دیر آصف کی پشت سے لگی رہی۔ اسکوٹر کے رکتے ہی اسے ہوش آیا' تو وہ فوراً الگ ہو کر گاڑی سے اتر گئی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں دل دھڑک رہا تھا۔ آصف کی آواز کانوں میں آئی۔ "بوبی' گھبراؤ نہیں.......... میں شریف آدمی ہوں تمہیں میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ سر جھکائے مکان میں داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی صوفوں کے درمیان ایک میز پر رائفل' ایک ریوالور' اور مختلف قسم کے چاقو چھرے رکھے ہوئے تھے۔ چھت پر پنکھے کی جگہ پھانسی کا ایک پھندا لٹک رہا تھا۔ میز پر اور کتنی ہی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن پر مختلف قسم کے زہر کے لیبل چسپاں تھے۔ بوبی نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ.......... یہ سب کیا ہے؟"

آصف نے جواب دیا۔ "خودکشی کا سامان ہے آج تک محبت میں ناکام ہونے والوں نے جتنے طریقوں سے اور جتنے ہتھیاروں سے خودکشی کی ہے وہ سب یہاں موجود ہیں۔ اتفاق سے ہم دونوں محبت میں ناکام ہو چکے ہیں۔"

بوبی نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی مرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ مجھے تمہارے روپ میں ایک نئی زندگی مل سکتی ہے اس لئے مرنے کا ارادہ نہیں ہے ہاں اگر تمہیں اعتماد نہ ہو کہ میں تمہیں بے لوث محبت اور زندہ رہنے کا حوصلہ دے سکتا ہوں تو خودکشی کر لو۔"

بوبی نے ایک خنجر کی طرف دیکھا آصف نے اس خنجر کو اٹھا کر کہا۔ "میں سوچتا ہوں کہ یہ خنجر سینے میں اتار لوں تو موت گلے لگے گی۔"

بوبی نے چشم تصور میں دیکھا آصف کی لاش ایک صوفہ پر پڑی ہوئی تھی اور وہی خنجر اس کے سینے میں پیوست تھا آصف کی آواز آئی۔ "اور اگر اس سینے پر تمہاری محبت ہو تو مجھے زندگی ملے گی۔" اب کی بار تصور میں صوفہ پر بیٹھا ہوا آصف زندہ نظر آیا کیونکہ جہاں خنجر تھا اب اسی جگہ سینے پر بوبی نے اپنا سر رکھ دیا تھا اس نے کسی کو زندگی دے دی تھی۔

آصف نے ریوالور اٹھا کر کہا۔ "محبت سے زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ نفرت سے مر جانا نہایت آسان ہے تم بڑی آسانی سے اس کی نال کنپٹی پر رکھ کر خودکشی کر سکتی ہو۔"

بوبی نے دیکھا۔ وہ ریوالور کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر کو دبا رہی تھی۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کے دیدے پھیل گئے' اس کا چہرہ مردہ ہو گیا۔ منظر بدل گیا اس نے دیکھا کہ

وہ پھولوں کی انجمن پر مسکرا رہی ہے جہاں اس نے ریوالور کی نال رکھ کر گولی چلائی تھی۔ وہیں سیاہ بالوں میں آصف پھول ٹانک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”جس سر میں موت کا سودا سماتا ہے اسی سر میں زندہ رہنے کی آرزو پھول کی طرح کھلتی ہے.........“ زندگی بے حد حسین نظر آ رہی تھی بوبی کے جذبے گنگنا رہے تھے۔

آصف نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟“

وہ چونک کر بولی۔ ”آں‘ آپ مجھے موت سے ڈرا رہے ہیں۔“

”نہیں۔ یہ بتا رہا ہوں کہ زندگی کتنی حسین ہے۔ ایک بے وفا کی خاطر اسے فنا نہیں کرنا چاہئے۔“

”میں ایک کے بعد دوسری ٹھوکر نہیں کھانا چاہتی۔“

”جو گر کر سنبھلنا سیکھ لیں وہ دوبارہ ٹھوکر نہیں کھاتے۔“

”میں اب کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔“

”میں بھروسے کی نہیں‘ زندہ رہنے کی بات کر رہا ہوں۔ زندہ رہنے کا ایک نسخہ یہ ہے کہ کسی سے کچھ پانے کی توقع نہ کرنا۔ اپنے پاس محبت کے جو خزانے ہیں لٹاتی رہو‘ کوئی تو قدر داں ملے گا۔“

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ آصف نے کہا۔ ”میں نے بھی تمہاری طرح زخم کھائے ہیں۔ میں صرف تمہیں پانے کی آرزو میں زندہ ہوں ورنہ کہو تو اس پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگا لوں؟“

بوبی نے دیکھا۔ وہ صوفوں کی درمیانی میز پر چڑھ کر پھندے کو اپنے گلے میں ڈال رہا تھا دوسرا منظر یہ تھا کہ بوبی آصف کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور بڑے پیار سے اپنی باہوں کا پھندا اس کے گلے میں ڈالے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ ایک بار پلک جھپکنے سے آصف کی گردن میں پھانسی کا پھندا نظر آتا تھا دوسری بار پلک جھپکنے سے آصف اس کی باہوں کے پھندے میں مسکراتا تھا۔

پھر اچانک آصف نے درمیانی میز کو ٹھوکر مار کر گرا دیا۔ خودکشی کا عمل پورا ہو گیا۔ پھانسی کے پھندے نے آصف کی گردن جکڑ لی۔ مردہ جسم جھولنے لگا۔ بوبی یکبارگی چیخ مارتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے گلے میں باہوں کا پھندا ڈال کر لپٹ گئی۔ ”نہیں‘ میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔ میں زندہ رہوں گی.........“

آصف نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نہیں‘ ہم زندہ رہیں گے۔“

بوبی نے بھیگی آنکھوں سے دیکھا وہ زندہ تھا‘ مسکرا رہا تھا اور اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اس نے اپنا سر اس کے کشادہ سینے پر رکھ دیا ان کے دل دھڑک رہے تھے کانوں میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔ موت ٹل گئی تھی زندگی کے نئے راستے پر آتش بازیوں کے جگمگاتے ہوئے رنگ بکھر رہے تھے۔

ہسپتال کا وہی کمرہ تھا۔ وحید کے سامنے بوبی ایک کرسی پر بیٹھی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ تصویر کے پیچھے ماضی کو دیکھ رہی تھی۔

وحید نے کہا۔ ”تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ اس تصویر کے ذریعے تمہیں بلیک میل کروں گا لیکن میں ایسا کم ظرف نہیں ہوں۔“

”تم کیا ہو۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہوئی بولی۔ ”آصف اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔“

اس نے تصویر کے ٹکڑے وحید کے منہ پر پھینک دیئے۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”بے شک تم گناہ گار نہیں ہو۔ میں پہلے بھی تمہاری عزت کرتا تھا اب بھی تمہاری عزت کرتا ہوں۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے اب تک تمہاری تصویر کو سینے سے لگائے رکھا۔ چلو اچھا ہوا تم نے اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ اب غصہ تھوک دو۔“

”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم سے خوش ہونے یا ناراض ہونے والا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”بوبی! میں نے تم سے فریب کیا اس کی سزا مجھے مل گئی ہے۔ ثمینہ نے طلاق لے کر مجھ سے ناطہ توڑ لیا ہے چچا جان نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اگر انجمن ڈاکٹر بن کر یہاں نہ آتی تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا اس کی کوششوں سے میں نے ہسپتال کے احاطے میں دواؤں کی ایک دکان کھولی ہے۔“

”تمہاری بہن تو تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہے کیونکہ تم نے اس کی خاطر ایک غریب کو دھوکہ دیا اور ایک امیر زادی سے شادی کی تھی۔“

”مجھے شرمندہ نہ کرو بوبی! یہ بتاؤ آصف کے ساتھ کیسے گزر رہی ہے؟“

”یہاں کتنے ہی شداد آئے مگر جنت نہ بنا سکے۔ کیونکہ صرف آصف جیسے شوہر ہی ہماری دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔ ہمارا گھر خوبصورت ہے۔ وہ ایک مدرسہ ہے۔ جو نوجوان شادی سے پہلے محبت کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ہاں بلا کر سمجھاتے ہیں سبق پڑھاتے ہیں کہ کسی لڑکی کا آنچل میلا نہ کرو‘ اسے راہ چلتے نہ چھیڑو۔ آپس میں سمجھوتہ کرو۔ اگر وہ

تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے تو تم اسے کبھی دھوکہ نہ دو۔"

دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی انجمن نے آصف سے کہا۔ "تمہارا گھر تو بہت ہی اچھا مدرسہ ہے‘ کیا مجھے اپنے گھر نہیں بلاؤ گے؟"

"میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہیں۔"

"بوبی برا تو نہیں مانے گی؟"

دوسرے کمرے میں بوبی نے کہا۔ "آصف تنگ نظر نہیں ہیں کہ برا مان جائیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ آئندہ تم مجھ سے ملو۔"

"بوبی! میں نے جو غلطی کی ہے‘ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے کہ میں تمہارے اور آصف کے کسی کام آتا رہوں۔"

بوبی نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے سنجیدہ اور شریف ہو گئے ہو۔"

"تم مجھے تھوڑا سا موقع دو۔ میں اپنی شرافت کا ثبوت ضرور پیش کروں گا۔ ارے ہاں۔ یہ تو پوچھنا بھول ہی گیا۔ ان تین برسوں میں کوئی ننھا منا گود میں آیا ہے یا نہیں۔"

وہ اچانک اداس ہو گئی۔ وحید نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا سمجھ گیا۔ انجمن بہت ہی قابل ڈاکٹر ہے۔ تم معائنہ کرا سکتی ہو۔"

دوسرے کمرے میں آصف نے کہا۔ "معائنہ ہو چکا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ ماں بن سکتی ہے۔"

انجمن نے کہا۔ "تو پھر تمہیں اپنا چیک اپ کرانا چاہئے چلو میں تمہیں ڈاکٹر زیدی سے ملا دیتی ہوں۔"

"نہیں انجمن! ہماری ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار ہے خدانخواستہ ڈاکٹر نے یہ کہہ دیا کہ میں باپ نہیں بن سکتا تو بوبی کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جائے گی۔"

"یعنی تم دونوں خود کو دھوکا دے رہے ہو۔ یہ دانش مندی نہیں ہے۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنی خوبیوں اور خامیوں کا علم ہونا چاہئے لیکن میں بوبی کو........"

"تم بوبی کو نہ بتاؤ۔ چپ چاپ ڈاکٹر زیدی سے کنسلٹ کرو۔ اگر معائنہ کے بعد بوبی سے چھپانے والی بات ہو تو اس سے چھپائے رکھنا وہ اپنی امیدوں کے سہارے بہلتی رہے گی۔ چلو اٹھو دیر نہ کرو۔"

آصف گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ انجمن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "جو لوگ اپنی خامیوں کا حساب نہیں رکھتے دوسرے لوگ ان خامیوں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔"

آصف اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا وہ بولی۔ "اگر تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے گھر میں کوئی چور دروازہ بھی ہے تو کوئی بھی اپنے گھر کا کچرا اس چور دروازے کے راستے تمہارے گھر میں پھینک کر جا سکتا ہے۔ چلو اٹھو........؟"

اس نے آصف کا ہاتھ تھام لیا۔ دوسرے کمرے میں وحید نے کہا۔ "بوبی! تم بہت معصوم ہو تمہیں اپنی بھلائی کے لئے آصف کا معائنہ کرانا چاہیے۔ دیکھو‘ بعض اوقات عورت بانجھ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود عرصہ دراز تک ماں نہیں بن سکتی۔ مرد قدرت کی مرضی نہیں دیکھتا۔ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔"

"آصف کبھی دوسری شادی نہیں کریں گے۔"

"خدا کرے تمہارا اعتماد قائم رہے مگر یہ خون کے رشتے بڑے اہم ہوتے ہیں ان کے لئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میں نے بہن کی خاطر تم سے بے وفائی کی۔ آصف زندگی کے کسی موڑ پر اولاد کی خاطر دوسری شادی کے لئے سوچ سکتا ہے۔"

"تم نے ملتے ہی مجھے بہکانا شروع کر دیا۔"

"نہیں بوبی! تم مجھے دشمن سمجھ لو مگر میں دوست بن کر سمجھا رہا ہوں۔ اگر آصف کے معائنہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ باپ بن سکتا ہے تو تم اسی کے بچے کی ماں بنو گی اور اگر معائنہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ باپ نہیں بن سکتا تو پھر دوسری شادی کے متعلق کبھی نہیں سوچے گا۔ اس کا معائنہ ہر حال میں تمہارے لیے مفید ثابت ہو گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تمہارے مشورے کا شکریہ۔ میں آصف کی بیوی ہوں اور آصف سے مشورہ لئے بغیر تمہارا مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔"

اس نے جانے کے لئے دروازے کا رخ کیا۔ پھر ٹھٹک گئی۔ دروازے پر آصف اور انجمن کھڑے تھے۔ وحید نے چونک کر آصف کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہیلو آصف! میں تو بوبی کو سمجھا رہا تھا کہ........"

"میں نے سن لیا ہے۔" آصف نے کہا۔ "انجمن بھی مجھے تمہاری طرح سمجھا رہی تھی۔ اپنی بہن سے پوچھو۔ میں نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ بوبی کے مشورے کے بغیر میں ڈاکٹر زیدی سے کنسلٹ نہیں کروں گا۔"

بوبی نے خوش ہو کر آصف کا بازو تھام لیا۔ وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی سنا تھا کہ محبت میں دل ملتے ہیں۔ تم دونوں کے تو دماغ بھی ملتے ہیں دونوں ایک ہی طرح سے سوچتے ہو۔“

انجمن نے کہا۔ ”ہاؤ ایور۔ کیا میں نے اور بھائی جان نے غلط مشورہ دیا ہے؟“

آصف نے کہا۔ ”تم دونوں نے دوستانہ مشورہ دیا ہے۔ تم کیا کہتی ہو بوبی؟“

بوبی نے جواب دیا۔ ”دوستوں کے مشورے میں خلوص اور سچائی ہو تو اسے قبول کرلینا چاہیئے۔“

اتنے میں ڈاکٹر زیدی واپس آگیا۔ اس نے انجمن سے کہا۔ ”ہیلو ڈاکٹر! تمہارے ساتھ بڑی بھیڑ ہے خیریت تو ہے؟“

وہ بولی۔ ”جی ہاں خیریت ہی ہے۔“ اس نے بوبی اور وحید سے کہا۔ ”آپ لوگ ذرا باہر جائیں پلیز ڈونٹ مائنڈ.........“

بوبی نے آصف کو دیکھا۔ آصف نے اس کے شانے پر تھپک کر کہا۔ ”جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ وحید کے ساتھ باہر چلی گئی۔

☆==========☆==========☆

بیڈروم میں زیرو پاور کے بلب کی مٹی مٹی سی روشنی تھی فوم کے بیڈ پر آصف اور بوبی لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی سوچ میں گم تھے۔ پھر بوبی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”صبح نہیں ہو رہی ہے۔“

آصف نے کہا۔ ”ہاں صبح ہو جائے گی تو پھر شام ہونے میں دیر ہو جائے گی۔“

”آپ کو ڈاکٹر سے کہنا چاہیئے کہ وہ صبح ہی ہمیں خوشخبری سنا دے۔“

”خوشخبری۔“ آصف نے سر گھما کر دیکھا پھر جلدی سے بولا۔ ”ارے ہاں اگر ڈاکٹر مجھے باپ بننے کی خوشخبری سنا دے تو یہ ہم دونوں کے لیے خوش خبری ہو گی۔“

”آصف! آپ سچ بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر ہمیں مایوس نہ کرے۔ تمہاری ممتا کے ارمان پورے ہو جائیں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ تمہارے دل میں باپ بننے کی جو حسرت ہے وہ پوری ہو جائے۔“

”اگر یہ حسرت پوری نہ ہوئی تو؟“

”تو.......... مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ باپ بننے کے لئے دوسری شادی کرلیں گے؟“

اس نے ہنستے ہوئے اسے ”پگلی“ کہا پھر سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

”اگر ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی تو ٹھیک ہے‘ ورنہ کوئی بری خبر بوبی کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے‘ بوبی کا دل ٹوٹ جائے گا کہ یہ کبھی میرے بچے کا باپ نہیں بن سکے گا۔“

”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں باپ بننے کے لئے ہرجائی بن کر دوسری شادی کر سکتا ہوں تو تم بھی ماں بننے کے لئے مجھے دھوکہ دے سکتی ہو۔“

وہ غصے سے پلٹ کر بولی۔ ”میں آپ کا منہ نوچ لوں گی۔“

”پہلے مجھے تمہارا منہ نوچنا چاہئے۔ کیونکہ پہلے تم نے مجھ پر بیوفائی کا الزام لگایا ہے۔“

”میں نے اس لئے کہا کہ مرد ایسے ہوتے ہیں۔ انہیں دوسری شادی کرتے دیر نہیں لگتی۔“

”عورتوں نے بھی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کیا تم سمجھتی ہو اس دنیا میں بے وفا عورت نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہے۔ مگر میں ایسی نہیں ہوں۔“

”اور میں بھی ایسا نہیں ہوں۔“

”بس جانے دیں۔ منہ کے سامنے سبھی محبت جتایا کرتے ہیں۔“

”اسی لئے تم میرے سامنے جتا رہی ہو۔“

وہ چڑ گئی ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی۔“

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ پھر سوچنے لگی۔ میں نے خواہ مخواہ آصف کو ڈاکٹر زیدی کے پاس جانے کے لئے کہہ دیا۔ اگر ڈاکٹر نے ان سے کہہ دیا کہ وہ باپ نہیں بن سکتے تو ان کے دل میں ہمیشہ یہی اندیشہ رہے گا کہ مگر میں انہیں چھوڑ کر ماں بننے کی خاطر دوسری شادی نہیں کروں گی۔ مجھے آصف کے دماغ سے اس شبہ کو مٹانا ہو گا مگر کیسے؟ وہ سوچتی رہی۔ رات گزرتی رہی۔

☆=========☆=========☆

وحید اپنے کمرے میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے شراب کا جام تھا مگر خیالوں میں بوبی بول رہی تھی۔ ”وحید! میں ایسی شراب ہوں جسے تم کبھی نہ پی سکے۔ مگر میرا نشہ تمہارے دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ اب تم مجھے دیکھتے رہو گے اور ترستے رہو گے۔“

وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ جہاں دیکھتا تھا وہاں بوبی نظر آتی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا نشہ میں لڑکھڑاتا ہوا بوبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولنے لگا۔ ”بوبی! میں نے تمہیں پیار کا فریب دے کر چھوڑ دیا مگر میں ظالم نہیں ہوں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد میں نے انجمن کو ماں کی محبت اور باپ کی شفقت دی ہے۔ میں نے بہن کی زندگی سنوارنے کے لئے صرف تمہیں نہیں آپ کو بھی برباد کر لیا ہے۔ میں کس طرح دل چیر کر دکھاؤں اس دل میں اب تک تم ہی ہو اور تم ہی رہو گی۔“

کمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بوبی کا خیالی پیکر فنا ہو گیا وحید نے چونک کر دیکھا بند دروازے کے پاس انجمن کھڑی ہوئی تھی اور پوچھ رہی تھی۔

”بھائی جان! آپ نے میرے لئے کیسی قربانی دی ہے؟ کیا اسے قربانی کہتے ہیں کہ مجھے ایک ڈاکٹر بنانے کے لئے میری محبت کو چھین کر اسے بوبی کے حوالے کر دیا؟“

”انجم! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ میں نے بوبی سے نہیں کہا تھا کہ وہ مجھ سے مایوس ہو کر آصف سے شادی کر لے۔“

”آپ نے مجھ سے تو کہا تھا کہ میں شادی سے پہلے آصف کے اخراجات پر تعلیم حاصل نہ کروں۔ آپ جیسے بھائی کو غیرت آتی ہے۔ آپ نے بڑے بھائی کی حیثیت سے حکم دیا کہ میں تین سال کے لئے شادی سے انکار کر دوں۔ میں نے آپ کا حکم مان لیا۔ آصف مجھے سمجھاتے رہے مناتے رہے لیکن میں اسی ضد پر اڑی رہی کہ تعلیم کے بعد شادی کروں گی!؟“

آپ بتائیں کہ وہ آصف مجھے کہاں ملیں گے کیسے ملیں گے؟“

کھوپڑی کے گنبد میں بہن کا سوال گونجنے لگا۔ ”وہ آصف مجھے کہاں ملیں گے؟ کیسے ملیں گے؟“

انجمن نے کہا۔ ”آج میں نے بوبی کی خوش نصیبی دیکھی ہے آصف اسے کتنا چاہتے ہیں۔ اس کے مشورے کے بغیر کوئی اہم قدم نہیں اٹھاتے۔ آپ نے کہا تھا کہ شادی کے

بعد تعلیم جاری نہیں رہتی مگر بوبی اب تک کالج میں پڑھ رہی ہے۔ آج مجھے آصف سے جو کچھ حاصل کرنا تھا' وہ بوبی حاصل کر رہی ہے۔ مجھے خوش نصیب بنانے والے بھائی جان! آپ جواب دیں کہ میں بدنصیب کیسے بن گئی؟“

وحید ہارے ہوئے جواری کی طرح شراب کے جام کے پاس آیا پھر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”شراب کی یہ خوبی ہے کہ اسے پی کر آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ آج میں سچ بول رہا ہوں۔ میں ایک ہی رات میں دولت مند بن جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھائی بہن اتنے اونچے ہو جائیں' اتنے اونچے ہو جائیں کہ بوبی اور آصف جیسے لوگ ہمیں سر اٹھا کر دیکھیں تو ان کی گردن دکھنے لگے۔“

وہ بولی۔ ”بے ایمانی کی دولت سے اپنی ہی گردن ٹوٹ جاتی ہے آج ہمارے ہی سر جھک گئے ہیں۔“

”نہیں انجمن! میں تمہارا سر نہیں جھکنے دوں گا ذرا انتظار کرو۔ آصف تمہارے سامنے جھکنے آئے گا۔“

”کیسے؟“ انجمن نے حیرانی سے پوچھا۔

”آصف کی میڈیکل رپورٹ کل ڈاکٹر زیدی کے سامنے جائے گی لیکن میں نے آج ہی لیبارٹری میں جا کر وہ رپورٹ پڑھ لی ہے۔“

انجمن نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”رپورٹ کیا ہے؟“

اس نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔ ”وہ باپ نہیں بن سکتا۔“

”اوہ.........“ انجمن گہری ہمدردی سے اوہ کہہ کر رہ گئی۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ خوشخبری سن کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

انجمن نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا یہ خوشخبری ہے؟“

”ہاں! آصف باپ نہیں بن سکے گا لیکن بوبی ماں......... بن سکے گی۔“

”کیا آپ کو بہت زیادہ نشہ ہو گیا ہے؟ وہ تو کبھی ماں بن نہیں سکے گی۔“

وہ لڑکھڑاتا ہوا میز کے پاس آیا۔ وہاں دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اس نے جام بھرنے کے لئے ایک بوتل اٹھائی۔ وہ خالی تھی۔ وحید نے اسے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ آصف کی طرح خالی ہے مگر یہ جام ضرور بھرے گا دوسری بوتل سے.........“

اس نے دوسری بوتل کھولی۔ پھر اس بوتل کی شراب کو جام کے بلوریں بدن میں انڈیلنے لگا۔ ساتھ ہی بڑبڑانے لگا۔ ”میں نے آج پہلی ملاقات میں سمجھ لیا ہے کہ وہ ماں

بننے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ ہمارے سامنے وہ تڑپنے کا اظہار نہیں کر سکتی کیونکہ اس طرح شوہر کی شکایت ہو جائے گی۔ مگر تم اطمینان رکھو..........“

یہ کہتے ہوئے اس نے انجمن کی طرف رخ کیا۔ وہ وہاں نہیں تھی بھائی کو شراب کی بوتل کی طرف بڑھتے دیکھ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولا۔

”اچھا ہوا تم چلی گئیں۔ میں تمہارے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ..........“

اس نے شیشے کے جام میں ہلکورے کھاتی ہوئی شراب کو دیکھ کر کہا۔ ”وہ میرے بچے کی ماں بنے گی..........“

☆==========☆==========☆

بوبی اور آصف اپنے مکان کے سامنے موٹر سائیکل پر بیٹھ رہے تھے۔ بوبی نے کہا۔

”میں نے کہہ دیا ہے پہلے ہسپتال جاؤں گی' رپورٹ دیکھوں گی۔ اس کے بعد کالج جاؤں گی۔“

”اور میں نے کہہ دیا ہے کہ پہلے تم کالج جاؤ گی۔ آج تمہارا پہلا پرچہ ہے۔ تمہیں وہاں وقت سے پہلے پہنچنا چاہیے۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ گاڑی کے شور میں وہ زور سے بولی۔

”جب تک مجھے رپورٹ معلوم نہیں ہو گی۔ میں سکون سے پرچہ نہیں دے سکوں گی۔“

وہ اونچی آواز میں بولا۔ ”بوبی! تم میرا غرور ہو۔ تمہیں سکون سے امتحان میں بیٹھ کر اچھے نمبروں سے پاس ہونا پڑے گا۔ میں انجمن کو دکھانا چاہتا ہوں کہ عورت شادی کے بعد بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری ناکامی مجھے انجمن کے سامنے شرمندہ کرے؟“

بوبی نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر اپنا سر اس کی پشت سے ٹیک دیا۔

انجمن ڈاکٹر زیدی کے کمرے میں بیٹھی کسی مریض کے کیس پر بحث کر رہی تھی۔ ڈاکٹر [illegible] نے کہا۔ ”کل صبح آپریشن کا وقت مقرر کر دو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

وہ میز پر جھک کر کاغذ پر لکھنے لگا۔ انجمن نے کہا۔ ”ڈاکٹر! وہ' میں مسٹر آصف کی رپورٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر نے لکھنے کے دوران کہا۔ ”ٹرے میں ہے۔“

انجمن نے آگے بڑھ کر فائلوں کی ٹرے میں سے ایک کاغذ ڈھونڈ کر نکالا۔ اسے پڑھتے پڑھتے مایوس ہو گئی۔ ”اوہ! ڈاکٹر میاں بیوی کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“

”کیا.......... ان سے یہ.......... رپورٹ چھپائی نہیں جا سکتی؟“

ڈاکٹر زیدی نے سر اٹھا کر کہا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

وہ بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ مسٹر آصف کو ایک خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے جھوٹی تسلی دی جائے۔ اگر آپ یہ لکھ دیں کہ..........“

ڈاکٹر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر انجمن! تم ایک ذمے دار ڈاکٹر ہو' تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کے نسخے میں ذرا سی تبدیلی آجائے تو مریض کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔“

”مسٹر آصف مریض نہیں۔ بدنصیب ہیں۔“

”ہاں۔ مگر وہ ایک مرد ہے۔ اسے جوانمردی سے اپنی بدنصیبی کو فیس کرنے دو۔ مجھ سے غلط رپورٹنگ کی توقع نہ کرو۔ دیٹس آل۔“

وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے میز کے پاس آکر ریسیور اٹھایا.......... ”ہیلو..........“

دوسری طرف آصف ریسیور اٹھائے ہوئے تھا۔ بوبی بے چینی سے ریسیور کو دیکھ رہی تھی۔ آصف نے کہا۔ ”ہیلو انجمن! میں بوبی کے کالج سے فون کر رہا ہوں۔ بھئی یہ بوبی ضد کر رہی ہے کہ یہیں سے رپورٹ معلوم کر لوں۔ کیا تم ابھی بتا سکتی ہو؟“

انجمن ہچکچانے لگی۔ پھر بولی۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ یہاں آؤ۔ ہم ڈاکٹر زیدی کے پاس جا کر معلوم کریں گے۔“

”بہت دیر ہو جائے گی۔ بوبی کا پرچہ شروع ہونے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مطمئن ہو کر امتحان ہال میں بیٹھے..........“

”اسے مطمئن کر دو تاکہ وہ کسی ایک امتحان میں تو کامیاب ہو سکے۔“

”آں..........“ آصف کچھ کھٹک گیا۔ بوبی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ ”خوشخبری' بالکل خوشخبری ہے تم ماں بن سکتی ہو۔“

بوڑھی پرنسپل دیدے پھاڑ کر بوبی کو دیکھنے لگی۔ بوبی نے کہا۔ ”یہ تو میں جانتی ہوں۔ یہ پوچھو کہ تم باپ بن سکتے ہو یا نہیں؟“

”بھئی یہی تو خوشخبری ہے کہ بن سکتا ہوں۔“

پرنسپل عینک لگا کر آصف کو گھورنے لگی۔

بوبی نے آصف کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر کہا۔ "ہیلو انجمن! کیا یہ سچ ہے؟"

انجمن نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تمہیں اپنے شوہر کے سچ پر یقین نہیں ہے.........."

"یہ بات نہیں ہے۔ ایسی خوشخبری ڈاکٹروں سے کم ملتی ہے۔ اس لئے میں کنفرم کرنا چاہتی تھی۔"

"اِٹ از کنفرمڈ۔ اب امتحان ہال میں جاؤ۔"

آصف نے بوبی سے ریسیور لے کر کہا۔ "میں ابھی آ رہا ہوں۔" پھر ریسیور رکھ کر بوبی کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر جبری مسکراہٹ تھی اس نے کہا۔ "اب تو تمہیں اطمینان ہوگیا۔ چلو.........."

تھوڑی دیر بعد بوبی امتحان ہال میں بیٹھی، قلم منہ میں دبائے مسکرا رہی تھی، سوچ رہی تھی اور لکھتی جا رہی تھی۔

کالج کے احاطے میں آصف کھڑا ہوا دور امتحان ہال کی طرف اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بوبی کو سکون سے لکھتے دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر اسے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بوڑھی پرنسپل کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"یُو آر اے گُڈ بوائے۔ اگر بوبی کو تم جھوٹی تسلی نہ دیتے تو وہ اتنی مطمئن ہو کر ہال میں نہ بیٹھتی۔"

آصف نے تعجب سے پوچھا۔ "آ۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ میں نے جھوٹ کہا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "بیٹے! فیس ریڈنگ میری ہابی ہے۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم باپ نہیں بن سکتے.........."

آصف کا ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے پر گیا۔ وہ بہت ہی دلبرداشتہ نظر آ رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

انجمن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے آصف! اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری تقدیر کو بدلنے کی ضرور کوئی تدبیر کرتی۔"

آصف ایک کرسی پر بیٹھا میڈیکل رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔ "سب ہی تدبیر کرتے ہیں پھر بھی تقدیر نہیں بدل سکتے۔ مجھ میں جو کمی ہے، اس کا مجھے دکھ

ہے لیکن بوبی کی فکر زیادہ ہے۔ یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد وہ امتحان کا ایک پرچہ بھی اٹینڈ نہیں کر سکے گی۔"

وحید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے اسے یہ رپورٹ نہ دکھاؤ۔"

"وہ ضرور دیکھنا چاہے گی۔"

انجمن نے کہا۔ "تم کیسے شوہر ہو۔ اپنی بیوی کو بہلا نہیں سکتے۔"

"وہ بچی نہیں ہے مگر بچوں سے زیادہ ضدی ہے۔"

وحید نے کہا۔ "ضدی بچوں کو کھلونا دے کر بہلایا جاتا ہے۔"

انجمن ہنسنے لگی۔ آصف نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا تم دونوں میری مجبوریوں کا مذاق اڑا رہے ہو؟"

انجمن سنجیدہ ہوگئی۔ "نہیں آصف! تم غلط نہ سمجھو۔ میں تمہاری پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھ کر.........."

آصف اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "تم نے کب میری پریشانیوں کو سمجھا ہے؟ میں گزرے ہوئے وقت کو بھول نہیں سکتا اور نہ تم دونوں بھول سکتے ہو۔ میری مجبوریوں پر ہنسنے کا یہ اچھا موقعہ ہاتھ آیا ہے.........."

وہ جانے لگا۔ انجمن اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "رک جاؤ آصف! آج میں تمہاری ساری شکایتیں دُور کر دوں گی۔"

وحید پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "تمہاری پریشانی میری پریشانی ہے۔ میں اسے دُور کر دوں گی۔ تمہاری اس رپورٹ کو غلط ثابت کر دوں گی۔"

"کیسے؟" آصف نے پوچھا۔ انجمن ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگی پھر اس نے وہ کاغذ وحید کو دیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! اگر آپ دولت کی خاطر بوبی کو دھوکہ نہ دیتے تو آج میں آصف کی نظروں سے ایسے نہ گرتی۔ اب اس غلطی کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم بوبی کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے جھوٹی رپورٹ تیار کریں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ جرم ہے مگر میرے نیک ارادوں کو خدا سمجھ رہا ہے۔"

وحید نے انجمن کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دیکھا۔ پھر آصف کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بہن نے بڑی سے بڑی رقم کو ٹھکرا دیا۔ مگر آج تک کبھی کسی کو جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں دیا۔ آج تمہارے لئے یہ اپنے مقام سے گر رہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ آصف نے ندامت اور احسان مندی سے انجمن کو دیکھا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑکی کے پاس چلی گئی وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ ”انجمن! میں نے پریشانی کی حالت میں جو کچھ کہا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں......... میں شرمندہ ہوں۔“

اس کی آنسو بھری آواز سنائی دی۔ ”تم مجھے کبھی سمجھ نہ سکو گے۔ میں پہلے بھی تمہیں چاہتی تھی۔ آج بھی تمہارے لئے زندہ ہوں۔ یہ میرے پیار کی سچائی ہے کہ میں نے کسی کے لئے سہاگ کا جوڑا نہیں پہنا اور نہ کبھی پہنوں گی۔“

”یہ تمہاری ضد ہے۔“

”اگر ضد ہوتی تو میں تمہیں بوبی سے چھین لینے کی ضرور کوشش کرتی مگر میں جھوٹی تسلی کے پیچھے اسے نئی زندگی دے رہی ہوں۔“

”تم۔ تم بہت اچھی ہو انجم۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”آہ! برسوں بعد تم نے انجم کہا ہے۔“

وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے ایک نیکی اور چاہتا ہوں۔“

”میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔“

”میں چاہتا ہوں کہ بوبی کو کبھی حقیقت معلوم نہ ہو۔ وہ جھوٹی تسلی سے بہلتی رہے۔“

”یعنی میں اس کے سامنے کبھی زبان نہ کھولوں۔“

”ہاں! آج میں نے اسے امتحان ہال میں دیکھا ہے۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔“

انجمن اس کی طرف پلٹ کر بولی۔ ”وہ ہمیشہ خوش رہے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم وعدہ کرو کہ مجھ سے ملتے رہو گے۔“

”مم......... میں۔ مگر.........“

”کیا کسی سے ملنا گناہ ہے؟“

”نہیں۔ مگر وہ بوبی؟“

”تم بوبی سے نہیں‘ مجھ سے ڈرتے ہو‘ آصف! میں وہ آگ ہوں جس نے تمہیں کبھی نہیں جلایا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا نہیں سکتی مگر کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے دوستی کا فریب تو کھا سکتی ہوں۔“

وہ پس و پیش میں رہا۔ انجمن نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں تمہاری خاطر بوبی کو جھوٹی تسلی دے رہی ہوں۔ تم مجھے جھوٹی دوستی ہی دے دو۔“

آصف کی نظریں جھک گئیں۔ وہ انجمن کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

بوبی کالج کے بس اسٹاپ پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ وحید کی کار اس کے سامنے آکر رک گئی۔ ”ہیلو بوبی!“ وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”فار یور انفارمیشن۔ آصف تمہیں لینے نہیں آئے گا۔ یہ دیکھو.........“

اس نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ بوبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگی۔ آصف نے لکھا تھا۔ ”بوبی! دفتر میں بہت کام ہے میں شام تک مصروف ہوں۔ میں نے انجمن کو فون کیا تھا۔ وہ تمہارے لئے گاڑی بھیج رہی ہے۔ بلا تکلف گھر چلی جاؤ۔ تمہارا اور صرف تمہارا آصف۔“

وہاں سے دور بہت دور آصف کی موٹر سائیکل تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ آصف کے پیچھے انجمن اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے بیٹھی تھی گاڑی کا انجن شور مچا رہا تھا۔ انجمن نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے آج بوبی سے دوسرا جھوٹ بولنا پڑا۔“

”یہ بھی سوچو کہ یہ جھوٹ کتنا خوبصورت ہے؟“

انجمن نے یہ کہہ کر اپنی سانس لیتی ہوئی جوانی کا بوجھ اس کی پشت پر ڈال دیا۔

بوبی کار کی اگلی سیٹ پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وحید نے ڈرائیو کرنے کے دوران اسے کن انکھیوں سے دیکھا پھر کہا۔ ”بوبی! انسان کی اعلیٰ ظرفی یہ ہوتی ہے کہ وہ پچھلی رنجشیں بھلا دیتا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں کہ تمہیں آصف جیسا جیون ساتھی مل گیا۔ مگر تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔“

”میں ناراض نہیں ہوں۔ سوچ رہی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو؟“

”کیا تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو؟“

”ہاں۔ وہ ڈیش بورڈ کھول کر دیکھو۔ وہاں تمہاری سوچی ہوئی باتیں ایک کاغذ پر

لکھی ہوئی ہیں۔"

"اچھا؟" بوبی نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر ڈیش بورڈ کو کھول دیا۔ اس کے اندر سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ ہے' رپورٹ نہیں خوشخبری ہے۔ اس خوشی میں اب تو مجھے معاف کردو۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "جاؤ معاف کیا۔"

"اب کوئی رنجش نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔"

"کوئی شکایت نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔ نہیں ہے۔"

"تو پھر آج کسی اچھے سے ہوٹل میں لنچ کریں۔"

وہ گھور کر بولی.......... "تم تو انگلی پکڑتے ہی پونچا پکڑنے لگے۔"

"اس میں بھی تمہارا فائدہ ہے۔"

"ذرا سنوں تو کیا فائدہ ہے؟"

"پہلے لنچ کا وعدہ کرو۔"

"اچھا وعدہ۔ اب بتاؤ۔"

"دیکھو' لنچ کے بعد میں سیدھا گھر جاؤں گا۔ ٹوپی پہن کر نماز پڑھوں گا۔ پھر دعا مانگوں گا۔ اے خدا! جتنی جلدی ہو سکے۔ بوبی کے گھر میں ایک ننھے سے مہمان کو بھیج دے.........."

بوبی نے شرما کر کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی مسرتوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

پھولوں کے جھرمٹ میں آصف سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ انجمن نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لئے ایک خوبصورت سا تحفہ لائی ہوں۔ آنکھیں بند کرو۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا اس تحفے کو بند آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے؟"

"ہاں! پہلے آنکھیں تو بند کرو۔"

آصف نے آنکھیں بند کرلیں۔ انجمن نے ایک گلاب کا پھول آگے بڑھا کر اس کے

ہونٹوں سے لگا دیا۔ آصف نے سانس کھینچ کر اس کی خوشبو کو محسوس کیا۔ پھر آنکھیں کھول دیں لیکن کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر مرجھا گیا۔

انجمن نے پوچھا۔ "کیا تحفہ پسند نہیں آیا؟"

وہ پھول کو ہاتھ میں لے کر گہری سنجیدگی سے اسے دیکھنے کے بعد بولا۔ "وہ بہت خوش ہوگی کہ اس کی گود میں پھول کھلنے والا ہے۔"

☆==========☆==========☆

بوبی اپنی خواب گاہ میں گنگناتی ہوئی بستر کی چادر درست کر رہی تھی۔ اس نے ایک خوش رنگ ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ساڑھی ایسے سلیقے سے پہنی گئی تھی کہ بدن کے نشیب و فراز چیخ رہے تھے۔ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے آکر اپنا آپ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے جوڑے میں لگی ہوئی پھولوں کی وینی کو درست کیا۔ آئینے میں دور ایک دیوار پر بچے کی تصویر نظر آرہی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بچہ مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔ گنگناتی ہوئی تصویر کے پاس پہنچی۔ اسے دیوار سے الگ کر کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر آنکھیں بند کرلیں۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ بستر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے تصویر کو بڑے پیار سے چوم کر اسے پلنگ کے سرہانے اوپر کے ایک ریک پر رکھ دیا۔ پھر ذرا پیچھے جا کر اسے دیکھنے لگی۔ بچہ مسکرا رہا تھا۔ وہ اور پیچھے گئی۔ ستی میں جھومتی ہوئی' گنگناتی ہوئی سوئچ بورڈ کے پاس آگئی۔ روشنی میں خالی سیج تھی اور مسکراتا ہوا بچہ تھا۔

بوبی نے سوئچ آف کیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ خیالوں میں بہت ساری مترنم آوازیں گنگنا رہی تھیں اس نے سوئچ آن کیا۔ روشنی میں خالی بستر پر پھولوں کی پتیاں برس رہی تھیں۔ بچہ مسکرا رہا تھا۔ رات گنگنا رہی تھی۔

اس نے پھر سوئچ کو آف کیا۔ تاریکی چھا گئی۔ ساتھ ہی ایک بچے کی شہد بھری آواز سنائی دی۔ "ما۔ ماں۔ آں۔ ماں.........."

اس نے جلدی سے سوئچ آن کردیا۔ بستر خالی تھا۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھے خواب زدہ سی ہو کر مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سماعت میں اب تک مترنم آوازیں گنگنا رہی تھیں۔

آصف خواب گاہ کے دروازے پر کھڑا بوبی کی خوشیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جذبات کو سمجھ رہا تھا اور گہری اداس و شکست خوردہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بوبی

بچے کی تصویر کو دیکھنے میں محو تھی۔ ایسے وقت تصویر کے شیشے میں آصف نظر آیا۔ ایک ہی فریم میں مسکراتا ہوا بچہ بھی تھا اور اس کے ساتھ بوبی اور آصف کا عکس بھی نظر آرہا تھا۔

بوبی نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو وہ عین نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے سولہ سنگھار کو دیکھ رہا تھا اور ساڑھی کے ڈھلکے ہوئے آنچل کے پیچھے تک رہا تھا۔ سانس لیتا ہوا سینہ جیسے جذبوں کے ہجوم میں ہانپ رہا تھا۔ وہ شرماتی ہوئی اپنے آنچل کو سینے پر درست کرنے لگی۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر وہی گنگناہٹیں اس کی ساعت میں گونجنے لگیں۔ آصف نے سرگوشی میں کہا۔

”یہ جاگتی ہوئی شب‘ یہ مہکتا ہوا شباب‘ یہ روپ سنگھار‘ یہ گوری بانہوں کا ہار میرے لئے ہے۔“

بوبی کی مسکراتی آنکھوں‘ اور خاموش جذبوں نے کہا۔ ”ہاں تیرے لئے......... تیرے لئے ہے۔ پر میری آنکھوں کے سندر سپنوں میں ایک شہزادہ مجھے بلاتا ہے۔“

”کون ہے وہ......... ذرا نام بتانا؟“

”وہ تیرے میرے پیار کا سایہ ہے۔ جب تُو میرے پاس ہوتا ہے وہ بھی دل کے قریب ہوتا ہے۔“

بچے کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ بوبی شرمیلی اداؤں سے پھولوں بھری سیج پر لیٹ رہی تھی۔ آصف نے اُداس نظروں سے بچے کی تصویر کو دیکھا۔ پھر بوبی کی خاطر مسکراتے ہوئے اس پر جھکنے لگا۔ بوبی کی خاموش ادائیں بول رہی تھیں۔

”جب تیرے پیار کی سیج پہ ہوتی ہوں۔ وہ میری سوچ کے پالنے میں جھولتا ہے۔ میرے محبوب مجھے بتا۔ میرے سُونے آنگن میں تیری چاندنی کب کھلے گی.........؟“

آصف اسے پیار سے برت رہا تھا۔ ”شاید یہی وہ رات ہے ہاں شاید یہی وہ رات ہے.........“

بچے کی مسکراتی ہوئی تصویر پر اچانک کمرے کی تاریکی چھا گئی لیکن کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ موٹر سائیکل پر آصف کے پیچھے کبھی بوبی بیٹھتی تھی اور کبھی انجمن اس کی پشت سے لگی گھومتی پھرتی نظر آتی تھی۔

ایک بار بوبی نے آصف سے شکایت کی۔ ”اب تو تم روز ہی دفتر سے لیٹ آنے لگے

ہو۔ آخر یہ دفتر کا کام اچانک کیسے بڑھ گیا؟“

”بھئی‘ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ دفتر کا کام ہے۔ کبھی کم ہوتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے۔“

”امتحانات ختم ہو چکے ہیں۔ کالج بند ہوگیا ہے۔ میں یہاں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔“

”میں کوشش کروں گا کہ کام جلد ختم ہو جائے اور آج تو ہماری شادی کی چوتھی سالگرہ ہے۔ آج میں چار بجے سے پہلے آجاؤں گا۔ انجمن اور وحید کو بھی فون کردوں گا۔ بڑا ہنگامہ رہے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

وہ خوش ہو کر مسکراتے ہوئے مکان کے احاطے تک آئی۔ آصف نے گیٹ کھول کر باہر جاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم تو گھر میں ہی رہو گی نا بوبی؟“

”ہاں۔ کیوں؟“

”وہ.........“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”وہ مستری کارخانے سے موٹر سائیکل لے کر آئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ تم شاپنگ کے لئے جاؤ اور مستری گاڑی لاکر واپس لے جائے۔“

”نہیں۔ میں گھر میں رہوں گی۔“

وہ مطمئن ہو کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

انجمن ہسپتال میں بیٹھی ہوئی ایک مریضہ کے لئے نسخہ لکھ رہی تھی۔ اس نے مریضہ کو نسخہ دے کر رخصت کرنے کے بعد تھکے ہوئے انداز میں گہری سانس لی۔ پھر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی۔ سوچتے سوچتے اس کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ پھر وہ میز پر جھک کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھانے کے بعد نمبر ڈائل کرنے لگی۔

وحید ہسپتال کے کاریڈور سے گزرتا آرہا تھا۔ وہ انجمن کی آواز سن کر کمرے کے دروازے پر رک گیا۔ انجمن ریوالونگ چیئر پر گھومتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”ہیلو آصف! کیا ہو رہا ہے؟“

آصف نے دوسری طرف سے کہا۔ ”ہوگا کیا؟ تم مجھے دفتر میں چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ ایسا کب تک ہوگا انجم؟ بوبی آج ہی شکایت کررہی تھی کہ.........“

انجمن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کہ شوہر حضرات کو دیر سے گھر نہیں آنا چاہئے۔ اچھا ایسا کرو۔ آج میں جلدی آجاتی ہوں۔ تمہیں جلدی چھٹی دے دوں گی۔ اوکے؟ آں‘ نہیں؟ اچھا۔ ہاں اوہ ویری نائس آج تمہاری شادی کی سالگرہ ہے۔ پہلے کیوں نہ بتایا؟ بوبی

تو بڑی خوش ہو گی؟"

وحید سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ انجمن ہوں ہاں کر رہی تھی وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا دروازے سے واپس چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

بوبی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کارخانے کا مستری احاطے کا گیٹ کھول کر موٹر سائیکل لا رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے پلٹ گئی۔ سنگھار میز سے پرس اٹھا کر تیزی سے چلتی ہوئی مکان سے باہر آئی پھر پرس کھولتے ہوئے مستری سے پوچھا۔ "کتنا بل ہے؟"

"وہ تو ہم صاحب سے لے لیتے ہیں۔ اس لئے میں بل لے کر نہیں آیا۔ اچھا سلام........"

وہ سلام کرکے رخصت ہو گیا۔ بوبی نے ایک نظر موٹر سائیکل پر ڈالی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اس کے بعد راہداری سے گزرنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے بے زاری سے پلٹ کر دروازے کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔

دروازے پر وحید اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک بہت بڑے پیکٹ کو سنبھالے کھڑا تھا۔ اس نے پیکٹ کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "شادی کی سالگرہ مبارک ٹو یو........"

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "تقریب شام کو ہے۔ تم ابھی سے کیوں چلے آئے؟ چلو آجاؤ۔"

وہ اندر آیا۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "تمہارے آصف صاحب کہاں ہیں؟"

"دفتر گئے ہیں۔"

"سالگرہ کے دن بھی دفتر؟ تمہارا شوہر تو بہت ہی تھرڈ کلاس آدمی ہے۔"

"اے لنگویج پلیز........"

وہ ڈرائنگ روم کے سینٹر ٹیبل پر سامان رکھتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی سنے گا تو یہی کہے گا اگر تم اپنے شوہر کو تھرڈ کلاس کے بجائے فرسٹ کلاس بنانا چاہتی ہو تو چلو ہم اسے پکڑ کر یہاں لائیں اور اسے سمجھائیں کہ کام تو روز ہوتا ہے سالگرہ سال میں ایک دن

منائی جاتی ہے۔"

"ابھی میں یہی سوچ رہی تھی۔ تنہائی میں دل گھبرا رہا تھا مگر........" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"جب سوچ لیا ہے تو اگر مگر کچھ نہیں۔ آصف کی موٹر سائیکل موجود ہے یہاں سے میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے آصف کے ساتھ چلی آنا۔"

وہ سوچنے لگی۔ وحید نے پوچھا........ "کیا تم نے آصف کے لئے کوئی تحفہ خریدا ہے؟"

"یہی تو پریشانی ہے کہ اب تک نہیں خریدا۔"

"تو پھر بیٹھی کیا سوچ رہی ہو؟ چلو اٹھو........"

اس نے بوبی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

وہاں سے دور انجمن کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ آصف اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انجمن نے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کیا تحفہ دوں؟"

"ہر ایک کے ساتھ یہی پرابلم ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ بوبی کے لئے کون سا تحفہ خریدوں؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "دراصل تم بوبی کو خوش کرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں خوش کرنا چاہتی ہوں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جیتنے کے لئے تحفے کی رشوت دینے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔ میں تو بوبی کو جیت چکا ہوں۔"

"جیتنے کے بعد بھی جیتنے کے لئے کچھ رہ جاتا ہے۔"

آصف کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ مرد اپنی عورت کو اولاد کا تحفہ دے کر ہی مکمل طور پر جیت سکتا ہے۔"

☆==========☆==========☆

دفتر کے چپراسی نے بوبی اور وحید کو دیکھتے ہی کہا۔ "السلام علیکم بیگم صاحبہ! صاحب تو جا چکے ہیں۔"

بوبی نے وحید سے کہا۔ "اتنی دُور آنا بے کار ہوا۔ صاحب اپنے وعدے کے مطابق جلد ہی گھر پہنچ گئے ہیں۔"

"آصف پہلے گھر نہیں جائے گا۔ پہلے شاپنگ کرے گا۔ تمہارے لئے تحفے خریدے

گا۔ تم بھی کچھ خریدتی چلو۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے لفٹ میں آئے۔ لفٹ نیچے جانے لگی بوبی نے کہا۔ "مجھے مشورہ دو۔ آصف کے لئے کیا خریدنا چاہئے۔"

"فارن کا کوئی بہترین آئٹم ہونا چاہئے۔ آصف حیران رہ جائے گا۔"

"ہاں۔ میں بھی اسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

وہ لفٹ سے باہر آئے۔ پھر عمارت کے باہر جاتے ہوئے وحید نے کہا۔ "تم نے سپر ہائی وے کی مارکیٹ دیکھی ہے؟"

"ہاں۔ مگر وہ بہت دور ہے۔"

وحید نے موٹر سائیکل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "جہاں گاڑی ہو وہاں فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔"

"مگر آسمان کو دیکھو۔ بادل چھا رہے ہیں۔"

"یہ گرجنے والے ہیں۔ برسنے والے بادل نہیں ہیں۔ ہم اِدھر جائیں گے' اُدھر آئیں گے۔ چلو دیر نہ کرو۔"

بوبی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو کر اپنی رفتار دکھانے لگی۔

گرجنے والے بادل کبھی برس بھی جاتے ہیں۔ انجمن اور آصف نے کار کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے تھے۔ بارش کا پانی شیشوں کے باہر بیرونی مناظر کو دھندلا رہا تھا۔ انجمن نے کہا۔ "یہ تو بے وقت کی بارش شروع ہو گئی۔"

"ہاں۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہئے۔"

"پہلے میرے گھر چلو۔ میں لباس تبدیل کروں گی۔ پھر بوبی کو مبارکباد دینے تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"ہمارا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

آصف نے اچانک گھبرا کر کہا۔ "ارے گاڑی روکو.........."

انجمن نے بدحواسی میں اسٹیئرنگ کو گھمایا۔ کار اِدھر سے اُدھر ہونے لگی۔ پہیئے اور بریک کی آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

سپر ہائی وے کے سناٹے میں بوبی کی چیخ دور تک لہراتی چلی گئی۔ موٹر سائیکل ایک طرف گر پڑی تھی۔ اس کے دونوں پہیئے تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ دوسری طرف بوبی زمین پر پڑی کراہ رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے منظر گھوم رہا تھا۔ وحید نے اس

پر جھک کر پوچھا۔ "سوری بوبی! خیریت سے ہو نا؟"

بوبی نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وحید اسے سہارا دینے لگا۔ دونوں بارش میں بھیگ رہے تھے۔ سامنے بہت دور ایک جھگی نظر آ رہی تھی وحید نے کہا۔ "ذرا ہمت سے کام لو۔ ہمیں اس جھگی میں پناہ مل جائے گی۔"

بوبی نڈھال سی ہو کر اپنے بدن کا سارا بوجھ وحید پر ڈال کر.......... لڑکھڑاتی ہوئی چلنے لگی۔

انجمن نے اپنی خواب گاہ کی الماری سے ایک لباس نکال کر دور بیٹھے ہوئے آصف کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "یہ لباس کیسا رہے گا؟"

"اچھا رہے گا۔ فار گڈ سیک جلدی چلو۔ بوبی انتظار کر رہی ہوگی.........."

"تم خواہ مخواہ جلدی کر رہے ہو۔ اگر حادثہ ہو جاتا تو ہم گھر پہنچنے کے بجائے ہسپتال میں ہوتے۔" انجمن لباس لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا رہا۔

آصف نے کہا۔ "میں گھر پہنچا نہ ہسپتال' حادثے نہ ہوں تب بھی ہم کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔"

بوبی کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ وحید اسے سہارا دے کر ایک چارپائی پر لٹا رہا تھا۔ اس کا لباس پانی سے بھیگا ہوا تھا اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ وحید نے جھگی کے کمرے سے باہر آ کر ایک بوڑھے سے کہا۔ "گرما گرم چائے پلا دو۔ پیسوں کی فکر نہ کرو۔ یہ لو.........."

اس نے جیب سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر بوڑھے کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ادھر نہ آنا۔ چائے لینے میں خود ہی آجاؤں گا۔"

بوڑھا نوٹوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وحید نے کمرے میں آکر جھگی کے دروازے کو بند کر دیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اندر کڑک سنائی دی۔ بوبی آنکھیں بند کئے سردی سے کانپتی ہوئی اپنے بدن کو سکیڑنے لگی۔

وحید نے اپنا کوٹ اتار لیا۔ پھر اسے دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر یوں بڑھنے لگا۔ جیسے بوبی کے چیخنے سے پہلے اس کی چیخ کو کوٹ کے سائے میں دبوچنا چاہتا ہو۔ سیاہ کوٹ کی سیاہی پھیلتی آ رہی ہے۔ اچانک بوبی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا۔ اس پر کوٹ کی کالک پھیل گئی تھی۔

اس سیاہی میں ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔

آصف اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ دوڑتا ہوا باتھ روم کے دروازے پر آیا۔ "کیا ہوا انجم؟"

ایک چوہا اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ انجمن پھر ایک بار چیختی ہوئی باتھ روم کے دروازے کے پیچھے سے نکل کر آصف سے لپٹ گئی۔ جیسے بھڑکتے ہوئے شعلے آکر لپٹ گئے ہوں۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ انجمن کی ننگی باہیں گلے کا ہار بن گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے مکھن جیسے گورے گورے، چکنے چکنے شانوں پر نگاہیں پھسل رہی تھیں۔ پھر دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ انجمن کی آنکھوں میں خمار چھا رہا تھا۔ پیاسے لب تھرتھرا رہے تھے۔

آصف اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن پر لے گیا۔ اس کی گردن پر انجمن کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ اس الجھن کو سلجھانے لگا۔ انگلیاں آہستہ آہستہ ایک دوسری سے چھوٹنے اور الگ ہونے لگیں۔ پھر باہوں کا پھندہ ٹوٹ گیا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگا۔

وہ راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ "یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اور مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ اپنی اداؤں سے روکنے لگی۔ "میں آگ نہیں ہوں۔ پانی ہوں۔ آگ بجھاتی ہوں۔ مجھے چھو لو۔ میں پیاس بڑھاتی ہو........"

بھری برسات میں بھری جوانی کی ادائیں گنگنا رہی تھیں۔ یہ کترا رہا تھا وہ اترا رہی تھی۔ اپنے شباب کے ریشمی پھندوں میں الجھا رہی تھی۔ آخر کسی نہ کسی طرح اس نے خواب گاہ سے باہر آکر دروازے کو باہر سے بند کردیا۔ وہ اندر دروازہ پیٹتی رہ گئی اور وہ باہر بارش میں بھیگتا چلا گیا۔

☆=========☆=========☆

دیوار گھڑی شام کے سات بجا رہی تھی۔ اس دنیا میں ہر متحرک چیز ہمیشہ کے لئے یا تھوڑی دیر کے لئے رک جاتی ہے مگر وقت کے پاؤں کہیں نہیں رکتے۔ کچھوے کی چال سے آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

دیوار گھڑی رات کے دس بجانے لگی۔ خواب گاہ کا ماحول سگریٹ کے دھوئیں سے آلودہ ہو رہا تھا۔ آصف بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ایش ٹرے میں بھرے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے انتظار کی طوالت ظاہر کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی باہر

ایک گاڑی کی آواز سنائی دی وہ تیزی سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

کھڑکی کے باہر بارش ہو رہی تھی........ احاطے کے گیٹ کے باہر ایک عورت رکشا سے اتر کر کرایہ ادا کر رہی تھی۔ وہ بوبی ہی تھی۔ مگر نیم تاریکی اور بارش کی دھند میں پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اب وہ احاطے کا گیٹ کھول کر اندر آ رہی تھی۔ آصف کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا خواب گاہ سے باہر جانے لگا۔

وہ ڈرائنگ روم سے گزر کر راہداری میں آیا۔ وہاں سے گزرتا ہوا بیرونی دروازے پر پہنچا پھر اس نے دروازے کی چٹخنی گرا کر اسے ایک جھٹکے سے کھولا۔ اسی لمحے بجلی زور دار آواز سے کوندنے لگی۔ وہ بارش میں بھیگی کھڑی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں سے گہرے صدمے کا اظہار ہو رہا تھا اور وہ آگے بڑھنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"بوبی!" آصف نے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔

بوبی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں آصف نے سنجیدگی سے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ پھر اس کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔ آصف نے پچکارتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں رہ گئی تھیں؟ میں انتظار کرتے کرتے گھبرا گیا تھا۔"

"میں۔ میں تمہارے لئے تحفہ ریدنے گئی تھی۔"

"اور موٹر سائیکل؟"

"میں۔ میں وحید کے ساتھ گئی تھی۔ ہم موٹر سائیکل سے گر پڑے تھے۔"

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"چوٹ؟" بجلی پھر ایک بار کوند گئی۔ "نن۔ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم نے وحید اور موٹر سائیکل کو کہاں چھوڑ دیا؟"

بوبی اب ذرا ہچکچائی۔ اسے چشم تصور میں وہ جھگی نظر آنے لگی۔

جھگی کا بوڑھا مالک بوبی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا تھا۔ "بیٹی آنسو پونچھ لو، اس بات کو جھگی میں ہی دفن کر دو۔ اگر تم اپنے شوہر سے شکایت کرو گی تو وہ غیرت کے جوش میں اس بدمعاش کو قتل کر دے گا اور قتل کی سزا پھانسی ہوتی ہے۔"

بوبی گھبرا کر نہیں کے انداز میں سر ہلانے لگی۔

آصف نے پوچھا۔ "یہ سر ہلانے کا مطلب کیا ہوا؟"

"آں۔ وہ۔ وہ موٹر سائیکل خراب ہوگئی۔ وحید میرے ساتھ آ رہا تھا پھر وہ گلبرگ میں اتر گیا۔"

"بڑا بے ہودہ ہے اسے چاہیئے تھا کہ تمہیں یہاں پہنچا کر جاتا۔ بہرحال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تم بخیریت عزت و آبرو سے یہاں پہنچ گئیں۔" بجلی پھر ایک بار شور مچا کر خاموش ہوگئی۔

☆==========☆==========☆

جھگی کا بوڑھا مالک ایک پیالی میں چائے لے کر جھگی کے باہر آیا پھر موٹر سائیکل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاحب جی! گاڑی ٹھیک ہوگئی؟"

آصف نے گاڑی کی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہاں! بابا۔ بالکل ٹھیک ہوگئی۔"

بابا نے چائے کی پیالی بڑھا دی۔ آصف نے قبول کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔"

"تکلف نہیں غریب کی خوشی ہے بیٹا.......... بوبی بٹیا خیریت سے ہے نا؟"

"جی ہاں۔ آپ اسے پناہ نہ دیتے تو شاید وہ خیریت سے گھر نہ پہنچ سکتی۔"

"خدا اسے عزت و آبرو سے رکھے۔ ایک بات کہوں بیٹا۔ برا تو نہیں مانو گے؟"

وہ پیالی واپس کرتے ہوئے بولا۔ "میں بزرگوں کی عزت کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں؟"

"بیٹا! یہ تمہاری نئی تہذیب کچھ اچھی نہیں ہے۔"

وہ مسکرا کر موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ کو بری کیوں لگی؟"

"بس یونہی۔ اپنی بیوی کو دوستوں کے ساتھ اتنی دور سیر و تفریح کی اجازت دینا.........."

آصف نے چونک کر بوڑھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا جلدی سے بولا۔

"بوبی بہت اچھی ہے۔ نیک اور پارسا ہے مگر دوست اچھے نہ ہوں تو بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں۔"

"میاں بیوی کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ اعتماد نہ رہے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔ میں دوستوں پر نہیں اپنی بیوی پر اعتماد کرتا ہوں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر جھگی سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

انجمن نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "ہیلو آصف! کیا اب تک ناراض ہو؟"

آصف اپنے دفتر میں بیٹھا میز پر پھیلے ہوئے اخبار کو دیکھ رہا تھا اور ریسیور کان سے لگائے بول رہا تھا۔ "میں ناراض نہیں مصروف ہوں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔ سارا کام تمہارے ماتحت کرتے ہیں۔ حکم دو تو ابھی آجاؤں.........."

"نہیں انجمن! دوستی کی ایک حد ہوتی ہے۔" وہ اخبار کے ایک کالم پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں اس حد سے آگے نہیں بڑھوں گی۔"

"نہیں۔ اب یہ سلسلہ ختم کرو۔ آج میں بوبی کو بتا دوں گا کہ میں نے اس کی تسلی کے لئے جھوٹی رپورٹ دکھائی تھی۔ میں باپ نہیں بن سکتا۔"

"تم حماقت کرو گے۔"

آصف کی انگلی اخبار کے کالم کے ایک حصے پر رک گئی۔ وہ خوش ہو کر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ "ویل ڈن۔ بوبی پاس ہوگئی۔"

"کیا ہوگئی؟" انجمن نے پوچھا۔

آصف ریسیور رکھ کر خوشی سے مسکراتا ہوا اخبار ہاتھ میں لے کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر جیسے اسے پر لگ گئے وہ دفتر سے باہر آیا۔ عمارت سے باہر آیا۔ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ فاصلے کبھی کبھی یوں بھی سمٹ جاتے ہیں ادھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ادھر اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے مکان میں داخل ہوتے ہوئے آوازیں دی۔

"میری جان! کہاں ہو؟ آؤ میں تمہیں گلے لگا کر امتحان میں کامیاب ہونے کی خوشخبری سناؤں گا۔"

وہ ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک گیا۔

بوبی باتھ روم میں واش بیسن پر جھکی ہوئی تھی۔ اسے ابکائیاں آ رہی تھیں اور ابکائیوں کی آوازیں آصف تک پہنچ رہی تھیں۔

اچانک اس کی سماعت میں گنگناہٹیں لہرانے لگیں۔ بوبی گنگناتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔
"میرے محبوب مجھے بتا۔ میرے سُونے آنگن میں تیری چاندنی کب کھِلے گی..........؟"
آصف پریشان ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ باتھ روم سے بوبی کی کراہتی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے میں بچے کی تصویر مسکرا رہی تھی۔
آصف کو وہ دن یاد آیا۔ جب ہسپتال میں انجمن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ انجمن نے اس سے کہا تھا۔ "تمہیں اپنا چیک اپ کرانا چاہئے۔ چلو میں تمہیں ڈاکٹر زیدی سے ملا دیتی ہوں۔"
انجمن کی دوسری بات یاد آئی۔ "اگر تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے گھر میں کوئی چور دروازہ بھی ہے تو کوئی بھی اپنے گھر کا کچرا اس چور دروازے کے راستے تمہارے گھر میں پھینک کر جا سکتا ہے۔"
انجمن کی تیسری بات یاد آئی۔ "جو لوگ اپنی خامیوں کا حساب نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ ان خامیوں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔"
آصف کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں "کچرا.......... کچرا.........." ہر آواز کے ساتھ بچے کی مسکراتی ہوئی تصویر نگاہوں کے سامنے آنے لگی۔
بوبی دروازے کو تھام کر باتھ روم سے باہر آئی۔ آصف کو دیکھ کر ایک دم سے خوش ہو گئی۔ "آصف! میں.......... میں.........."
آصف نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ شرماتی ہوئی بولی۔
"مجھے شرم آتی ہے۔ انجمن کو بلاؤ۔ وہ مجھے دیکھنے کے بعد تمہیں بتائے گی۔"
وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

انجمن کے کمرے میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔
"ہیلو.......... اوہ آصف! آخر میں یاد آ گئی نا؟ ہاں.......... اچھا لو۔ تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ بولو.........."
وہ ہنسنے لگی۔ پھر حیرانی سے بولی۔ "کیا کہا؟ بوبی ماں بننے والی ہے؟ اِٹ از کوائٹ امپوسیبل.........."
انجمن نے یہ کہتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے وحید کو دیکھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر

جانے لگا۔ انجمن نے "ایک منٹ" کہہ کر ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا پھر بولی۔
"بھائی جان! ٹھہر جائیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ آصف باپ نہیں بن سکے گا لیکن بوبی ماں بنے گی۔ کیسے؟"
وہ لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے نشے کی حالت میں پیش گوئی کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ پیش گوئی سچ ثابت ہو گی.........."
"مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔"
"کوئی شخص کچھ نہیں جانتا۔ جب تک عورت یہ نہ بتائے کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے؟ اور یہ بوبی ہی بتا سکتی ہے.........."
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ انجمن ریسیور کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "ہیلو آصف! میں ابھی بوبی کو چیک کرنے آ رہی ہوں.........."
اس نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر میز پر سے دوائیوں کا بیگ اٹھا کر جانے لگی۔

☆==========☆==========☆

آصف اپنے مکان کے باہر خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ اندر سے انجمن کی آواز آ رہی تھی۔ "ہاں۔ ٹھیک ہے۔ سیدھی لیٹی رہو۔ کب سے یہ حالت ہے؟"
بوبی کی آواز سنائی دی۔ "بس آج ہی دو بار متلی ہوئی۔ اچار کھانے سے ذرا آرام آیا.........."
آصف کے چہرے سے ایسا کرب ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔
بوبی نے کہا۔ "انجمن! آصف کے سامنے کہتے مجھے شرم آ رہی ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں بلایا ہے ویسے تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں سمجھ گئی تھی۔ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔"
انجمن کا ہلکا سا طنز سنائی دیا۔ "ہاں۔ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ.......... غلط نہیں ہو سکتی۔"
بوبی نے پوچھا۔ "آصف کہاں ہے؟"
"پتہ نہیں۔ مجھے کہیں سے فون کیا تھا۔ میں سمجھی یہاں موجود ہوں گے۔"
آصف کھڑکی کے پاس سے چلا گیا۔

بوبی نے کہا۔ "تعجب ہے۔ کہاں چلے گئے؟"

انجمن نے کہا۔ "اچھا اب میں جاتی ہوں۔ آصف آئے تو کہنا مجھے فون کر لے۔"

وہ بیگ اٹھا کر باہر آئی۔ احاطے کے باہر اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے قریب آ کر کار کا دروازہ کھولا تو اگلی سیٹ پر آصف بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ بیگ کو پچھلی سیٹ پر رکھ کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

ڈرائیونگ کے دوران انجمن نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارے دُکھ کو سمجھ رہی ہوں۔"

وہ چپ رہا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر انجمن نے پوچھا۔ "مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا دکھ کیسے بانٹ سکتی ہوں؟"

"مجھ سے ایک نیکی اور کرو۔ اپنی جھوٹی رپورٹ پر قائم رہو۔ دنیا یہی سمجھے کہ وہ بچہ......... وہ۔ بچہ میرا ہے۔"

انجمن گاڑی ایک طرف روک کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "تم بوبی کو اب بھی چاہتے ہو؟"

"شاید یہ میری چاہت ہو لیکن میں بوبی کی ممتا سے انصاف کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو۔ میں باپ نہیں بن سکتا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں بوبی کو چھوڑ دیتا لیکن بوبی' مجھے نہ چھوڑتی۔ ہماری سوسائٹی میں ایک شوہر کو چھوڑ کر دوسرا شوہر کرنے والی عورت نظروں سے گر جاتی ہے۔ مرد بھی اپنی ہتک سمجھتا ہے اسے اولاد نہ دینے کے باوجود اس کا مجازی خدا بن کر رہنا چاہتا ہے۔ شادی کے بعد چار سال تک ہم ایک دوسرے کو بہلاتے رہے۔ آخر بوبی اپنی مامتا کے ہاتھوں ہار گئی۔ اس نے جو کچھ کیا اس میں میری خامیاں بھی شامل ہیں۔"

"میں تمہاری باتیں سمجھ رہی ہوں مگر اس بچے کو تمہارا نام نہیں مل سکتا۔"

"تمہاری جھوٹی رپورٹ کے مطابق میں باپ بن سکتا ہوں اگر تم راز دار بن کر رہنے کا وعدہ کرو تو بوبی کی عزت رہ جائے گی۔ ممتا کا سپنا پورا ہو جائے گا اور اس کے بچے کو میرا نام مل جائے گا۔"

"تم نے بوبی کی ممتا اور مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ کیا اسے تمہارے دکھ کا احساس ہو گا؟"

"میں نادان تھا اب تک پیار کے بدلے پیار چاہتا تھا۔ اب اتنی دور چلا جاؤں گا کہ اس کی یادیں بھی مٹتی چلی جائیں گی۔"

انجمن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

وہ اپنا ہاتھ ہٹا کر بولا۔ "نہیں۔ اب میں دوسری غلطی نہیں کروں گا۔"

"غلطی تمہاری نہیں بوبی کی ہے اور دنیا کی ہر عورت بوبی نہیں ہو سکتی۔"

"میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ضد نہ کرو۔ میں ایسا جاؤں گا کہ تم بھی مجھے ڈھونڈ نہیں سکو گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "اچھی بات ہے۔ تم میری قدر نہ کرو۔ مگر میں اپنے حصے کی وفا نبھاؤں گی۔ میں تمہیں اتنا چاہتی ہوں اتنا چاہتی ہوں کہ تمہیں دھوکہ دینے والی عورت کو معاف نہیں کروں گی۔"

آصف پریشان ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم مجھ سے نفرت کرو' میں بوبی سے نفرت کروں گی۔ اگر تم اسے میرے انتقام سے بچانا چاہتے ہو تو مجھے ساتھ لے چلو۔"

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ انجمن نے کہا۔ "سوچ لو آصف! بھائی جان بھی اس راز سے واقف ہیں۔ تم مجھے اپنا لو گے تو ان کی زبان بند ہو جائے گی۔"

آصف نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو تھام لیا۔ انجمن نے اس کا ایک ہاتھ تھام کر کہا۔

"جب تک ہمارا رشتہ مضبوط رہے گا۔ بوبی اور اس کے بچے کو تمہارا نام ملتا رہے گا۔"

☆==========☆==========☆

آصف کے دفتر کا چپراسی احاطے کا گیٹ کھول کر اندر آیا۔ پھر مکان کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بوبی نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم؟ صاحب کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ انہوں نے یہ خط دیا ہے۔"

اس نے ایک لفافہ دیا۔ بوبی اسے لے کر سوچتی ہوئی نظر سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے لفافے سے خط نکال کر پڑھنا شروع کر دیا لکھا تھا۔

"بوبی! میاں بیوی کے سپنے الگ الگ نہیں ہوتے۔ ہمارے سپنے سب اپنے ہوتے

ہیں مگر کبھی کبھی تعبیر بدل جاتی ہے۔ اپنے سپنے کی تعبیر تم ہی بتا سکتی ہو مگر تم سے پہلے ڈاکٹر زیدی نے بتا دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں مبارک باد دینے نہ آسکا۔ اچانک بہت بڑا بزنس مل گیا ہے۔ لاکھوں روپے کا منافع ہے۔ اس لئے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ شاید ملک سے باہر بھی جانا پڑے۔ میری فکر نہ کرو۔ تمہارا دل بہلانے کے لئے وہ بچہ کافی ہے۔ فقط آصف.........“

بوبی نے لفافے سے ایک چیک نکالا۔ پچاس ہزار روپے کا چیک تھا۔ اس نے چپراسی سے پوچھا۔ ”کیا صاحب کو اتنی جلدی تھی کہ وہ یہاں آکر اپنا سامان بھی نہیں لے گئے؟“

”پتہ نہیں بیگم صاحبہ! شاید انہیں سامان کی ضرورت نہ ہو کیونکہ وہ بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بریف کیس میں رکھ کر لے گئے ہیں۔“

”انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ شہر سے باہر کہاں گئے ہیں؟“

”جب آپ کو نہیں بتایا تو مجھے کیا بتاتے۔ میں تو نوکر ہوں۔“

بوبی کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ چپراسی سلام کر کے واپس چلا گیا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آئی۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی لیکن جب اس نے سر اٹھا کر بچے کی تصویر کو دیکھا تو اسے مسکراتے دیکھ کر بے اختیار پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

پھر وقت گزرنے لگا۔ وہ راتیں کروٹیں بدل کر گزارنے لگی۔ دن کو وہ ایسے مقامات پر جاتی، جہاں وہ آصف کے ساتھ کبھی وقت گزار چکی تھی۔ کبھی ڈاکئے سے پوچھتی کہ اس کے نام کوئی خط آیا ہے؟ دفتر کے مینجر نے بتایا۔ ”آصف صاحب کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اب تک ایک خط بھی نہیں آیا ہے۔“

وہ ہسپتال میں گئی۔ وہاں انجمن کی جگہ دوسری لیڈی ڈاکٹر بیٹھی ہوئی تھی اس نے بوبی سے کہا۔ ”ہاں مجھ سے پہلے ایک لیڈی ڈاکٹر انجمن تھیں۔ وہ استعفیٰ دے کر چلی گئیں۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں اس کے بھائی کا میڈیکل سٹور ہے آپ وہاں جا کر معلوم کریں۔“

میڈیکل اسٹور کے کاؤنٹر پر وحید کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا اس نے ایک کش لے کر دھواں چھوڑنے کے بعد بوبی سے کہا۔ ”تمہیں اسی دن میرے پاس آنا چاہیے تھا۔ جب آصف تمہیں چھوڑ کر گیا تھا کیونکہ اب میں ہی تمہارا سہارا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ انجمن کہاں ہے؟“

”وہ بھی اسی دن سے اچانک غائب ہو گئی۔ شاید بہت دنوں سے غائب ہونے کا چکر چل رہا تھا۔“

”تمہیں اپنی بہن کے بارے میں ایسی بات کہتے شرم نہیں آتی؟“

”شرم کیسی؟ آصف پر پہلا حق اس کا تھا۔ پہلی محبت ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ جیسے ہماری محبت رنگ لا رہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ گھور کر بولی۔ ”شاید تم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔“

وہ غصے سے پلٹ کر وہاں سے جانے لگی مگر غصے سے زیادہ غم اسے نڈھال کر رہا تھا۔ وحید کی باتیں کچوکے لگا رہی تھیں انجمن بھی اسی دن اچانک غائب ہو گئی شاید بہت دنوں سے غائب ہونے کا چکر چل رہا تھا۔

وہ ہسپتال کی کمپاؤنڈ وال کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ پھر آنسو بھرے لہجے میں اس نے آواز دی ”آصف.........“

☆==========☆==========☆

آصف کے ہونٹوں پر لرزش پیدا ہوئی۔ ہونٹوں سے آواز نہیں نکلی لیکن اس کی جنبش سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بوبی کا نام لے رہا ہے۔ انجمن نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ وہ بیمار پڑا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔ دیوار پر لگا ہوا کلینڈر بتا رہا تھا کہ ایک برس گزر چکا ہے۔ انجمن نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”آصف! آنکھیں کھولو۔ دوا پی لو۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر انجمن کے سہارے اٹھ کر دوا پینے لگا۔ اس کے بعد لیٹتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے لئے اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔“

”بیماری میں زیادہ نہیں بولتے۔ اب چپ چاپ سو جاؤ۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تو انجمن کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

انجمن نے کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا دیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ کبھی اندھیرا ہوتا تھا۔ کبھی اجالا۔ آصف کبھی سوتا تھا اور کبھی جاگتا تھا مگر انجمن ہمیشہ

جاگتی نظر آتی۔

پھر ایک بار آصف کی آنکھ کھلی تو انجمن اس کے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے خوابیدہ چہرے پر معصومیت تھی۔ کئی دنوں اور کئی راتوں کی تھکن کے آثار تھے۔ آصف اسے دیکھتے ہوئے ہمدردی اور احسان مندی سے سوچنے لگا۔ وہ سوچتے سوچتے الجھ رہا تھا۔

دوسری صبح وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ انجمن ایک پیالہ اور چمچ لئے اسے کچھ کھلا رہی تھی۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”اب میں اپنے ہاتھ سے کھا سکتا ہوں۔“

انجمن نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیکھ کر کہا۔ ”کبھی میں بھی دکھ مصیبت میں مبتلا ہو سکتی ہوں۔ کبھی مجھے تمہارے ہاتھ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”آں؟“ آصف نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”میں کچھ نہیں چاہتی۔ بس مجھے اپنے حصے کی وفا نبھانے دو۔“

”ایک برس گزر چکا ہے۔ آخر تم کب تک میرے ساتھ رہو گی؟“

”جب تک تم یہ نہ سمجھ لو کہ ہر عورت بے وفا نہیں ہوتی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ پھر بھی کسی کی بے وفائی نے میرے اعتماد کو خاک میں ملایا ہے۔“

”تم ایک کی سزا دوسری کو نہیں دے سکتے۔ اعتماد بحال کرنے کی تدبیر ہو سکتی ہے۔“

”کیسی تدبیر؟“

”تم مجھ پر آزمائشی اعتماد کرو۔ اگر کبھی تمہارے اعتماد کو مجھ سے ٹھیس پہنچے تو مجھے بھی ٹھکرا کر چلے جانا۔ میں اُف نہیں کروں گی۔“

آصف نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں پیالہ لئے کھڑی تھی۔ پیالے کو اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”صرف ایک بار۔ مجھے ایک بار آزما لو..........“

آصف کے دو سوچتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھے۔ پیالے کی طرف آئے۔ پھر ان ہاتھوں نے انجمن کے ہاتھوں سمیت پیالے کو تھام لیا۔ انجمن کی سماعت میں شہنائیاں گونج رہی تھیں۔

☆=========☆=========☆

وہ دلہن بنی گھونگھٹ نکالے سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھونگھٹ کی

اوٹ سے دیکھا۔ دولہا کے پاؤں قالین پر آہستہ آہستہ بڑھتے آ رہے ہیں۔ وہ حیا سے سمٹنے لگی۔

آصف سیج کے قریب آ کر رک گیا۔ دلہن کو دیکھنے لگا۔ چشم تصور میں بوبی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ آصف کا چہرہ ایک دم سے مرجھا گیا وہ پلٹ کر جانے لگا۔ دلہن نے ہاتھ تھام لیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ انجمن دلہن بنی اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”مجھے افسوس ہے میں نے اس کا سایہ دیکھا تھا۔“

”میں سایہ نہیں۔ تمام عمر کی ساتھی ہوں۔“

آصف نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ انجمن نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اندر پیار کے کتنے ہی گیت مچل رہے تھے۔ آصف اس کے چہرے پر جھک رہا تھا۔ اس کی بند پلکوں پر سجی ہوئی افشاں جگمگا رہی تھی۔

کہیں گیت کہیں نوحہ..........

بوبی کی بند پلکوں پر آنسوؤں کی بوندیں جگمگا رہی تھیں۔ اس کے اندر دھڑکتا ہوا دل نوحہ کناں تھا۔ وہ بستر پر لیٹی ایک ڈور کو تھامے پالنے کو ہلا رہی تھی۔ بوبی کی گود خالی تھی۔ پالنے کی گود میں ایک بے جان گڑیا سو رہی تھی۔

دیوار پر لگی ہوئی بچے کی مسکراتی ہوئی تصویر اچانک اپنی جگہ چھوڑ کر فرش پر گر پڑی۔

کہیں خزاں کہیں پیار..........

آصف اور انجمن پہاڑی مقام کی ہریالیوں میں گھوم رہے تھے۔ زندگی کی گود میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ سات رنگوں کی دھنک ان کے دلوں میں اتر رہی تھی۔ کبھی وہ پیک ٹرام میں بیٹھے بلندیوں سے گزر رہے تھے۔ کبھی پستیوں میں شاپنگ کر رہے تھے۔ زندگی کے ہنستے بولتے گیت ان کے ساتھ ساتھ رواں تھے۔

کبھی قہقہے، کبھی آنسو..........

بوبی گڑیا کو سینے سے لگائے آنسو بھری آنکھوں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر لان میں خزاں رسیدہ پتے اِدھر سے اُدھر اڑتے ہوئے، بھٹکتے ہوئے یوں شور مچا رہے تھے جیسے کوئی ماتمی راگ سنا رہے ہوں۔ شوکیس میں سجے ہوئے کھلونے اداس تھے۔ بوبی گڑیا

کو سینے سے لگائے آہستہ آہستہ بستر کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ بستر کے سرہانے والی میز پر آصف کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

پھر اسے دروازے پر دستک سنائی دی۔ بوبی نے چونک کر تصویر کو دیکھا۔ پھر دوسری طرف جیسے دروازے کو دیکھا۔ دستک پھر سنائی دی پہلے وہ زیرِ لب بولی۔ ”آصف.........“ دستک پھر سنائی دی۔ پھر وہ آصف کا نام لے کر چیختی ہوئی اٹھ کر بھاگی۔ دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی وہاں سے دوڑتی ہوئی راہداری میں پہنچی۔ پھر آصف کہتی ہوئی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر وحید مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ہائے ری محبت! اب بھی اسی کے نام سے دروازہ کھلتا ہے۔“

وہ دروازہ بند کرنے لگی۔ وحید نے روکتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو! آصف کا سراغ مل گیا ہے۔ میں اس کا ایڈریس لایا ہوں۔“

وہ جیب سے خط نکالنے لگا۔ بوبی نے بے تابی سے پوچھا.........”آصف نے مجھے خط لکھا ہے؟“

”نہیں۔ انجمن نے مجھے لکھا ہے۔ وہ آصف کی شریکِ حیات بن چکی ہے۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

اس نے لفافہ آگے بڑھا کر کہا۔ ”یہ سچ ہے۔ اس خط میں ان کا پتہ موجود ہے۔“

بوبی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس خط کو لیا۔ وحید نے کہا۔

”میں یہ خوش خبری سنانے اس لئے آیا ہوں کہ اب تم میری بہن کے راستے کی دیوار نہیں بن سکو گی۔ اب تمہارے سامنے یہی ایک راستہ ہے کہ انجمن کو مبارک باد دو اور آصف پر لعنت بھیجو اور میری جھولی میں آجاؤ۔“

”گیٹ آؤٹ۔“ بوبی نے چیختے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر وہ لفافے کو ایسی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ موت کا پروانہ ہو۔

اسے وہ دن یاد آنے لگا۔ جب وہ موٹر سائیکل پر آصف کے پیچھے بیٹھی دوسری شادی کے سلسلے میں بحث کر رہی تھی۔

بوبی نے کہا تھا۔ ”شاید ہمارے ستارے آپس میں نہیں ملتے۔ اگر آپ دوسری شادی کر لیں تو باپ بننے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔“

آصف نے پوچھا۔ ”اور دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہو تو؟“

”ضرور ہو گی۔“ وہ منہ پھیر کر دل پر جبر کرتی ہوئی بولی۔ ”آپ دوسری شادی کر لیں۔“

بوبی کی چشم تصور میں منظر بدل گیا۔

آصف اپنے دوستوں کے درمیان سہاگ کے جوڑے میں لپٹی ہوئی دلہن کے ساتھ کھڑا تھا اور آواز دے رہا تھا۔ ”بوبی! تم کہاں ہو؟ دیکھو میں نے وعدہ پورا کر دیا۔ دوسری گھر والی لے آیا ہوں۔“

چشم تصور کے مناظر ختم ہو گئے۔

بوبی بند دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ کھلا ہوا خط اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر راہداری کی محدود فضا میں کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

کٹی ہوئی پتنگ کھلی فضا میں ڈولتی ہوئی آصف کی طرف آرہی تھی۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ سر پر سے گزرنے والی پتنگ کو ہاتھ بڑھا کر تھام لیا۔ اسی وقت بچوں نے اس کے آس پاس آکر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سب سے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں وہ پتنگ تھما دی۔

ڈاکئے کی آواز آئی۔ ”آپ کا خط.........“

اس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے ڈاکئے سے خط لیا۔ مگر لفافے کے ایک طرف نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ وہ بڑبڑایا ”بوبی.........“

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اضطراری حالت میں اس کی مٹھی لفافے کو بھینچ رہی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ مٹھی کھلنے لگی۔ انگلیاں لفافے کو چاک کرنے لگیں۔ ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکلا۔ پھر آصف کے دونوں ہاتھوں میں وہ کاغذ کھل گیا۔

بوبی اس کے کانوں میں بولنے لگی۔

”آصف! میں اب تک نہ سمجھ سکی کہ تم میری کون سی غلطی کی سزائیں دے رہے ہو۔ دوسری شادی کی خوشی میں ہی مجھے میرا جرم بتا دو۔ اگر میرا جرم ثابت ہو جائے تو میں تمہارے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں گی اور اگر بے جرم سزائیں دے رہے ہو تو تمہارا ظلم تمہیں مبارک۔ میں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے میری غلطی بتا دو۔ فقط تمہاری اور صرف تمہاری بوبی.........“

اس نے خط کو دوبارہ مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے دروازے

سے اندر گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے آواز دی۔ "انجم! یہ دیکھو۔ بوبی کا خط آیا ہے۔ ڈھٹائی کی حد ہوتی ہے۔ وہ پوچھ رہی ہے کہ اس کا گناہ کیا ہے؟"

انجم ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھی پریشان نظروں سے آصف کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اب میں اسے لکھوں گا۔ اسے بتاؤں گا۔ مکار عورت! میں نے تیری شرم کے لئے تیرے گناہ کا حساب نہیں کیا تھا۔ تیری تسلی کے لئے تجھے ایک جھوٹی رپورٹ دکھائی تھی اب تک میں نے تیری ممتا کا بھرم رکھا۔ تیرے بچے کو اپنا نام دیا۔ مگر اب نہیں دوں گا اس لئے کہ میں باپ نہیں ہوں۔ میں باپ نہیں بن سکتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا........."

اس نے انجمن سے پوچھا۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹ کھلنا چاہتے تھے مگر وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ رہی تھی۔ آصف نے قدرے تعجب سے پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو؟"

وہ چپ رہی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"آں۔ وہ۔ وہ........."

"ہاں۔ ہاں بولو........."

"وہ۔ وہ تم باپ بن سکتے ہو۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

انجمن کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ پاس رکھی ہوئی تپائی پر گیا۔ تپائی پر اچار رکھا ہوا تھا۔

آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تم اچار کیوں.........؟"

یک بیک اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی سماعت میں بوبی کی آواز گونجنے لگی۔ "صبح سے دوبار متلی ہو چکی ہے۔ اچار کھانے سے آرام ہوتا ہے۔"

"نہیں........." آصف نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ انجمن اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔"

"تمہاری قسم سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مکار۔ فریبی........." اس نے ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ وہ گھوم کر تپائی پر گری، پھر اچار کی پلیٹ کے ساتھ فرش پر پہنچ گئی۔

"آصف!" وہ پلٹ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "میں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں اس معصوم بچے کی قسم کھاتی ہوں جو صرف میرا اور تمہارا ہے۔"

آصف نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے بوبی کی شرم رکھ لی تھی ورنہ اس کے سامنے جاتا تو وہ بھی اپنے بچے کی قسم کھا کر یہی کہتی۔ وہ اب بھی تمہاری طرح پارسا بن رہی ہے اور تم بھی ساری زندگی پارسا بن کر فریب دینا چاہتی ہو۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے........"

اس نے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر گر پڑی پھر جلدی سے سر اٹھا کر بولی۔ "میری بات مان لو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹری رپورٹ کبھی غلط بھی ہو سکتی ہے۔"

اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "تمہارا وقت آیا تو رپورٹ غلط ہونے لگی۔ یہ بات تم بوبی کے وقت بھی کہہ سکتی تھیں۔ مگر نہیں تم بھول رہی ہو۔ تم نے خود ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ پڑھ کر سنائی تھی۔ میں رپورٹ کے ٹیکنیکل الفاظ اور ہندسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ تم نے مجھے سمجھایا تھا کہ ٹیسٹنگ رپورٹ کے مطابق میں کبھی باپ نہیں بن سکوں گا۔ کیا تم نے مجھے غلط سمجھایا تھا؟ اگر تم مجھے اب فریب نہیں دے رہی ہو کیا اس وقت فریب دیا تھا؟"

وہ روتے ہوئے انداز میں بولی۔ "میرا خدا جانتا ہے کہ میں اب بھی سچ کہہ رہی ہوں اور اس وقت بھی سچ کہا تھا۔ یہ درست ہے کہ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ کے مطابق تم کبھی باپ نہیں بن سکتے مگر بن رہے ہو........."

"کیسے؟" وہ انجمن کا گلا دبوچنے کے انداز میں بولا۔ "مجھے ثبوت چاہئے۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

انجمن کے دیدے پھیل گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔ وہ رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی گردن پر آصف کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ میں نے بوبی کی طرح تمہیں بھی معاف کیا۔ تم دونوں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھاتی رہو گی۔ دنیا تم پر تھوکتی رہے گی اور تم اپنے بچوں کو کبھی اُن کے باپ کا نام نہیں بتا سکو گی........."

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ انجمن پریشان اپنی گردن سہلاتی رہی۔

☆=========☆=========☆

ٹرین تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ آصف ایک کمپارٹمنٹ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بیتے دنوں کی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کبھی انجمن اور کبھی بوبی، باری باری آنسو بہاتی نظر آ رہی تھیں۔ دونوں اپنے اپنے بچوں کو سینے سے لگائے اس سے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ تمہارا ہے۔ یہ تمہارا ہے.........“

وہ بڑے ذہنی کرب سے گزر رہا تھا۔

اس سے بہت دور انجمن اپنے بھائی وحید کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ میں یہاں ڈاکٹر زیدی سے ملنے آئی ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ لیبارٹری انچارج نے رپورٹ لکھتے وقت غلطی کی ہے۔“

وحید کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی وہ بولا۔ ”ڈاکٹر زیدی کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”میں لیبارٹری انچارج سے ملوں گی۔“

”اس کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو گیا ہے اگر وہ ہوتا تو تب بھی وہ ایک سال پرانی رپورٹ کی غلطی کو سمجھ نہ سکتا۔ اس کے علم میں جو درست تھا، وہی رپورٹ اس نے پیش کی تھی۔“

وہ روتی ہوئی جھنجلا کر بولی۔ ”تو پھر میں کیا کروں؟ آصف کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں بدچلن نہیں ہوں۔ میں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔“

”میں اسے یقین دلاؤں گا۔ وہ کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔ وہ بوبی کو ٹھکرا کر گیا۔ بوبی اسے تلاش نہ کر سکی اب وہ مجھے ٹھکرا کر گیا ہے۔ میں بھی اسے تلاش نہیں کر سکوں گی۔“

”میں اسے تلاش کروں گا۔“

وہ جانے لگا۔ انجمن نے کہا۔ ”ٹھہریئے! اگر وہ مل بھی گیا تو کسی ثبوت کے بغیر یقین نہیں کرے گا۔“

”میں ثبوت دوں گا۔“

”کیسے؟“

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک گہری سانس لے کر چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بوبی کے لئے گڑھا کھودا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بہن اسی گڑھے میں گر جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ وحید کو گھورتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

”میں نے.........میں نے رپورٹ بدل دی تھی۔“

وہ پوری قوت سے چیخ کر بولی.........”کیسے؟“

”لیبارٹری اسسٹنٹ میرا راز دار ہے۔ جب وہ رپورٹ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس وقت میں اس سے ملنے گیا۔ وہ میرے ناجائز کاروبار میں حصے دار ہے۔ ہم دونوں نشہ آور دوائیں چور دروازوں سے فروخت کرتے ہیں۔ میں نے اس کی جیب میں ایک ہزار روپے رکھے تو اس نے صحیح رپورٹ مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ آصف باپ بن سکتا ہے۔ میں نے کہا ایسی رپورٹ تیار کرو جو اسے چیلنج کرے کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔“

انجمن نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ صحیح رپورٹ کہاں ہے؟“

”اسے ہم نے جھوٹی رپورٹ کے طور پر بعد میں آصف کو دیا تھا۔“

انجمن کے ہاتھ وحید کے گریبان پر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ وحید نے کہا۔ ”مجھ جیسے لوگ جو نشہ آور دوائیں فروخت کرتے ہیں۔ انہیں بڑی ہیرا پھیری کرنا پڑتی ہے۔ میں ہسپتال کے تمام ڈاکٹروں کے دستخط کی نقل کامیابی سے کر لیتا ہوں۔ میں نے اصلی رپورٹ پر ڈاکٹر زیدی کے دستخط کئے تھے۔ اوہ گاڈ! مجھے کیا معلوم تھا کہ اس جعل سازی کی سزا میری اپنی بہن کو ملے گی۔“

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ”مجھے بہن نہ کہو۔ پتہ نہیں تمہارے جیسے دوا فروش ہسپتال کے ملازموں سے مل کر آئے دن کتنی بہنوں کی زندگیاں برباد کرتے رہتے ہیں۔ تم.........تم نے میری اور بوبی کی زندگی برباد کر دی۔ ہمارے بچوں سے ان کے باپ کا نام چھین لیا۔ اب آصف کو کہاں تلاش کریں۔ اسے کیسے یقین دلائیں کہ شیطان بھائی کے روپ میں بھی بہن کا سہاگ اجاڑ دیتا ہے۔“

”میں اسے تلاش کروں گا۔ میں اسے یقین دلاؤں گا۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆========☆========☆

آصف بے مقصد بھٹک رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر اڑنے والے پتے کی طرح اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ کبھی آبادیوں میں اور کبھی ویرانوں میں اس کا سفر جاری تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے میلے تھے مگر اسے اپنا ہوش نہ تھا۔

ایک چائے خانے کی ایک میز کے اطراف دو شخص بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے بوڑھے ساتھی سے کہا۔ ”صمد بھائی! اس دھندے میں جیل کی سلاخیں نظر آتی ہیں۔ مگر کمائی بہت ہے۔ تم نے بڑی دولت کمائی ہے۔“

صمد نے چائے کا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ ”ہاں دولت کمائی ہے مگر نقصان بھی اٹھا رہا ہوں۔ مجھے کینسر ہو گیا ہے۔“

”کینسر؟“

”ہاں۔ وہ جو کہتے ہیں نا‘ کہ کوئلے کی دلالی میں منہ کالا ہوتا ہے تو وہی میرا حال ہے۔ نشہ آور دوائیں فروخت کرتے کرتے میں خود نشے کا عادی ہو گیا۔ ڈاکٹر نے میرے مرض کو سمجھنے کے بعد رپورٹ لکھ دی کہ مجھ جیسے آدمی کو ہسپتال کی لیبارٹری میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے میری چھٹی ہو گئی۔“

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ناجائز دھندے کئے۔ ہم جیسے لوگ قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں۔ مگر اوپر والے کی لکھی ہوئی سزا ہمیں ضرور ملتی ہے۔ میرے ایک ساتھی کو بھی اس کی سزا مل رہی ہے۔ اس نے ایک شخص کو بانجھ ثابت کرنے کے لئے میری تیار کی ہوئی رپورٹ کو بدل دیا تھا۔ ایسے وقت کاتبِ تقدیر ہم پر ہنستا ہے۔ جانتے ہو کیا ہوا؟ خود اس کی بہن اس بانجھ......... آدمی کی بیوی بن گئی اور اب اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

”اوہ! یہ تو سچ مچ قدرت کی طرف سے دی ہوئی سزا ہے۔“

”ہاں۔ اب وہ اپنے بہنوئی کو تلاش کر رہا ہے۔ دوبارہ ڈاکٹری معائنے سے ہی ثابت ہو سکتا ہے کہ پہلی رپورٹ غلط تھی۔“

صمد کو اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ ”اس سالے کا نام کیا ہے؟“

صمد نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے تباہ حال آصف کھڑا ہوا تھا اس نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

آصف نے اس کا گریبان پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا نام بتاؤ۔ ورنہ کینسر

سے پہلے میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“

”وا۔ وا۔ وحید......... اس کا نام وحید ہے۔ سول ہسپتال کے احاطے میں اس کی دواؤں کی دکان ہے.........“

آصف نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ پھر دانت پیستے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔ اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔ ”فریبی۔ مکار۔ دونوں بھائی بہن مکار ہیں۔ انہوں نے پرانا انتقام لیا ہے۔ وحید بوبی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور انجمن نے مجھے جیتنے کے لئے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر یہ چال چلی ہے۔ میں......... میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا.........“ اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر بول رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور وہ ایک سمت بڑھتا جا رہا تھا۔

☆========☆========☆

جھگی کے اطراف تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ جھگی کے اندر بوڑھا بابا بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ غریب کی جھونپڑی کو یہ ہوائیں بار بار ستاتی ہیں۔ دروازہ بار بار کھل جاتا ہے۔“

وہ دروازے کو بند کرنے کے لئے آیا۔ پھر باہر کی طرف دیکھ کر رک گیا۔ باہر آصف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے لپٹی ہوئی چادر ہوا کی زد میں اِدھر اُدھر پھڑپھڑا رہی تھی۔ بوڑھا آنکھیں سکیڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا جھگی سے باہر آیا۔ آصف کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہاں بابا۔ ایک بار آپ نے کہا تھا یہ نئی تہذیب اچھی نہیں ہے۔ انسان کو رلاتی ہے۔“

بوڑھا یاد کرنے لگا۔ آصف نے کہا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کی اجازت نہیں دینا چاہئے۔“

”اوہ بوبی......... تم بوبی کے شوہر ہو۔ آؤ میری جھگی میں آؤ۔“

”نہیں۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اس روز بوبی اور اس کا بوائے فرینڈ بھٹک کر یہاں آئے تھے یا بھٹکنے کے لئے آئے تھے؟“

بوڑھے نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”بھٹک کر آئے تھے۔“

آصف نے چادر کے اندر ہاتھ سے نکالا۔ سو سو کے کئی نوٹ اس کی طرف بڑھاتا

ہوا بولا۔ ”میں سچ بولنے کی قیمت اس سے بھی زیادہ دوں گا۔“

”دولت کے ترازو میں تولا جانے والا سچ، سچ نہیں ہوتا۔ اس لالچ کو اپنی جیب میں رکھ لو۔ اس روز بھی اس شیطان نے مجھے بڑے بڑے نوٹ دیئے تھے۔“

یہ کہہ کر وہ اس دن کا واقعہ سنانے لگا آصف گم صم ہو کر اپنے دماغ کی اسکرین پر اس واقعے کی فلم دیکھ رہا تھا۔

اسکرین پر وحید نظر آیا۔ وہ جیب سے دس دس کے کچھ نوٹ نکال کر بوڑھے کو دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”گرما گرم چائے پلا دو۔ اور ہاں دروازے پر دستک نہ دینا۔ میں خود ہی آکر چائے لے جاؤں گا۔“

بوڑھا نوٹوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا مگر جب وحید نے کمرے میں جا کر دروازے کو بند کیا بوڑھا بابا سنجیدگی سے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ وحید نے اندر آکر بوبی کی جانب دیکھا۔ وہ بھیگی ہوئی چارپائی پر پڑی تھی۔ بدن کے نشیب و فراز گیلے لباس کے پیچھے بغاوت کر رہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو للچا رہے تھے۔

وحید اپنا کوٹ اتار کر اسے دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر بوبی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کئے سردی سے سکڑ رہی تھی۔ کوٹ کی سیاہی اس کی طرف بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی چیخ سنائی دی۔

بوڑھا بابا دوسرے کمرے سے دوڑتا ہوا باہر آنے لگا۔ بوبی اپنی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ وحید اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بابا دروازہ پیٹ کر کہہ رہا تھا۔ ”دروازہ کھولو، یہ کیا ہو رہا ہے۔ دروازہ کھولو۔“

بوبی وحید کی ناکام گرفت سے آزاد ہو کر چارپائی کے دوسری طرف چلی گئی۔ وحید چارپائی پر چڑھ کر آنا چاہتا تھا۔ بوبی نے چارپائی کو ایک طرف سے اٹھا دیا۔ وحید اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ ایک طرف الٹ کر فرش پر آرہا۔ اس کے اوپر چارپائی الٹ گئی۔ گرنے کے بعد سنبھلنے اور اٹھنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ جب وہ الٹی ہوئی چارپائی کے نیچے سے نکلا تو بوبی دروازہ کھول چکی تھی۔ بوڑھا بابا ہاتھ میں درانتی لئے کھڑا تھا۔ اس نے دس دس کے نوٹوں کو مٹھی میں بھینچ کر وحید کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم دونوں کو میاں بیوی سمجھا تھا۔ مگر تم تو شیطان نکلے۔“

بوبی نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میری جان، میرا جسم صرف میرے شوہر کے لئے ہے جب اسے معلوم ہو گا کہ تم مجھے ناپاک ارادے سے

یہاں لائے تھے تو وہ.........“

بوڑھے بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”نہیں بیٹی! اپنے شوہر سے کچھ نہ کہنا۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ اس بات کو اس جھگی میں ہی دفن کر دو۔“

پھر بابا نے وحید کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں اس درانتی سے تمہارے ٹکڑے کر سکتا ہوں مگر بات بڑھے گی تو یہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے.........“

وحید تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ بوبی نے روتے ہوئے اپنا سر بابا کے شانے پر رکھ دیا۔

آصف کے دماغ کی اسکرین سے وہ منظر ختم ہو گیا۔ اس کے آس پاس سے ہوائیں چلتی شور مچاتی ہوئی گزر رہی تھیں اور بوڑھے کی آواز کانوں کے راستے دل میں اتر رہی تھیں۔ ”بوبی پاک دامن ہے۔ وہ جتنی پاکیزگی سے آئی تھی، اتنی ہی پاکیزگی سے واپس گئی۔ یاد ہے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے، تم اپنے دوستوں پر نہیں، اپنی بیوی پر اعتماد کرتے ہو۔ پھر آج کیا بات ہوئی، کہ اعتماد کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے یہاں آئے ہو.........“

آصف کے قدم واپسی کے لئے مڑ گئے۔

قدموں کو جب منزل مل جاتی ہے تو فاصلے آپ ہی آپ سمٹنے لگتے ہیں۔

بوبی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ نظروں سے دور اپنے بچے کے لئے لوری گا رہی تھی۔ ایسی لوری جو آنکھوں کو گہری نیند سلا دیتی ہے۔

آصف کے قدم احاطے کے گیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ گیٹ کھول کر داخل ہو رہا تھا۔ خزاں رسیدہ لان میں سوکھے پتے ہوا میں اِدھر سے اُدھر بکھر رہے تھے اور لوری کی دھن میں کراہ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید اس لئے کھلا ہوا تھا کہ اس گھر کو لوٹنے کے لئے اب وہاں کچھ نہ رہا تھا۔ ساری پونجی لٹ چکی تھی۔ صرف بچے کا ایک پالنا اور ممتا کی لوری رہ گئی تھی۔

بوبی اپنی اجڑی ہوئی خواب گاہ کے فرش پر بیٹھی ایک ڈور کو تھامے پالنے کو جھلا رہی تھی۔ لوری گا رہی تھی۔ پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہی اس کی آواز تھم گئی۔ وہاں آصف سر جھکائے کھڑا تھا۔ بوبی بے یقینی سے دیکھتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”تم۔ تم آئے ہو؟ میری بربادیوں کا تماشہ دیکھنے؟“

وہ ندامت سے سر اٹھا کر بولا۔ ”بوبی.........“

"ہاں بولو۔ کیا میری غلطی بتانے آئے ہو خدا کی قسم میں اب تک اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا تم سے پانے کے لئے زندہ ہوں بولو۔"

"غلطی تمہاری نہیں میری تھی۔ میں انجمن اور وحید کے فریب میں آگیا۔ انہوں نے غلط میڈیکل رپورٹ دی تھی کہ میں باپ نہیں بن سکتا.........."

بوبی اسے بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری فرمائش پر انجمن اور وحید نے ایک جعلی رپورٹ تیار کی۔ تمہیں تسلی دی کہ میں باپ بن سکتا ہوں۔ مگر.......... مگر وہی جعلی رپورٹ درست تھی اور میں۔ میں سمجھتا رہا کہ تمہارا بچہ.......... میرا.......... میرا نہیں ہے۔"

بوبی کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ غصے میں بولی۔ "تم نے میرے لئے ایسی شرمناک باتیں سوچ لیں؟ اب کیا لینے آئے ہو میں.......... بے حیا ہوں.......... بد چلن ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے.........."

"میں جانے کے لئے نہیں، تمہیں پانے کے لئے آیا ہوں۔ تم زیادہ سے زیادہ میری غلطی کی سزا مجھے سنا سکتی ہو مگر میرے رشتے سے انکار نہیں کر سکتیں۔"

ہاں۔ سہاگ کے رشتے سے انکار نہیں کر سکتی مگر اعتماد کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔"

"تم بھول رہی ہو بوبی۔ ایک رشتے کی زنجیر اور ہے جو ہمیں کبھی الگ نہ ہونے دے گی اور وہ اولاد کے رشتے کی زنجیر ہے۔"

بوبی کی خاموش آنکھوں سے بہنے لگے۔

وہ بولا۔ "جب میں اپنے بچے کو سینے سے لگاؤں گا تو تم خود ہی کھنچی چلی آؤ گی۔ مجھے بتاؤ بیٹی ہے یا بیٹا؟"

وہ یوں سسکنے لگی جیسے سانس اٹک اٹک کر آرہی ہو۔

"تم نہیں بتاؤ گی۔ میں سمجھ گیا۔ بیٹا ہی ہوگا۔ میرا بیٹا.......... میرا منا.........."

وہ آگے بڑھتا ہوا پالنے کے پاس آکر جھکا پھر جیسے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پالنا اِدھر سے اُدھر ہو رہا تھا بے جان گڑیا سو رہی تھی اور بوبی کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں پھڑپھڑاتی ہوئی چمگادڑوں کی طرح کمرے کی محدود فضا میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ رو رو کر فریاد کرتی رہی تھی۔

"تم نے مجھے سہاگن بنا کر سہاگ کی خوشیاں چھین لیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی میری ممتا کے ارمانوں کے ساتھ دفن ہو گیا۔ تم بھی ظالم، تمہارا بیٹا بھی ظالم۔ وہ رلا کر چلا گیا۔ تم

رلانے آئے ہو۔ میں عورت ہوں۔ اپنا سب کچھ ہارنے کے بعد پھر ایک بار تم سے ہار جاؤں گی۔ تم سر کے تاج بنے رہو۔ میں پھر پاؤں کی جوتی بن جاؤں گی۔ میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں..........؟"

وہ پھر منہ چھپا کر رونے لگی۔ آصف ندامت سے اور صدمات سے چُور ہو کر آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا۔ پھر اس نے بوبی کا ہاتھ تھام لیا بوبی نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ پھر ایک دم سے چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

آصف نے اسے تھوڑی دیر تک رونے دیا۔ پھر اسے تھپک تھپک کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ بوبی۔ میں صبح کا بھولا ہوں، شام کو واپس آگیا ہوں۔ میں تمہیں صرف اپنا سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔"

وہ فوراً ہی آصف سے الگ ہو کر بولی۔ "انجمن.......... انجمن تمہاری ہے۔ مجھے چھوڑ کر جسے گلے لگایا ہے۔ اسے کیوں بھول رہے ہو؟"

اب میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"اب تو جھوٹ نہ بولو۔ کیا تم نے شادی نہیں کی تھی؟"

"کی تھی۔ مگر اسے طلاق دے دی۔"

"طلاق..........؟"

"ہاں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اُسے اور وحید کو گولی مار دوں۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا کہ میں قاتل بن کر اِس گھر کی جنت کو اور زیادہ جہنم بنا دوں گا۔ جیل جانے یا پھانسی پانے کے بعد میرا بچہ میرے سائے سے محروم ہو جائے گا اور نہ جانے تم اسے لے کر کہاں کہاں ٹھوکریں کھاؤ گی۔ اس لئے میں نے اسے طلاق دے دی۔ اس نے اپنے بھائی کے ساتھ تمہارے خلاف سازش کی۔ مجھے دھوکہ دیا۔ اس کی سزا یہی ہے کہ وہ سوسائٹی میں طلاق پانے والی عورت کہلائے اور اس کا بچہ ہمیشہ کے لئے میرے سائے سے محروم ہو جائے.........."

☆=========☆=========☆

انجمن کی گود میں بچہ رو رہا تھا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لیٹر پیڈ کے سائز کا ایک کاغذ پھڑپھڑا رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بال اور پریشان چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بری طرح برباد ہو چکی ہے۔

وحید دروازہ کھول کر سر جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں بھائی بہن کی نظریں ملیں۔ انجمن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وحید نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے بہت تلاش کیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے کہاں تلاش کروں؟“

انجمن نے ہونٹوں کو بھینچ کر اپنے بھائی کو غصے سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”وہ مل گیا ہے۔“

وہ خوش ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مل گیا؟ کیا آصف آگیا ہے؟“

انجمن نے خاموشی سے گھورتے ہوئے کاغذ کو اس کی طرف بڑھا دیا۔ وحید نے کاغذ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے انجمن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”انجمن! تم نے ایک بار مجھے ٹھکرا کر دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اپنے شیطان صفت بھائی کے ساتھ مل کر مجھے دھوکہ دیا۔ بوبی کی زندگی برباد کی اور ایک ڈاکٹر کے باعزت پیشے کو بدنام کیا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں بھائی بہن نے کس طرح میڈیکل رپورٹ کو بدل دیا تھا۔ اب تم میرے بچے کی ماں بن کر بھی مجھے متاثر نہیں کر سکو گی۔ اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکو گی۔ تمہیں اور تمہارے بھائی کو........ عبرتناک موت کی سزا ملنا چاہئے۔ مگر میں تمہیں عبرتناک زندگی کی سزا دے رہا ہوں۔

تمہارے فریب اور مکاریوں کا یقین کر لینے کے بعد میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں........ تمہیں طلاق دے رہا........ تمہیں طلاق دے رہا ہوں........“

وہ طلاق نامہ وحید کے چہرے کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ وحید نے تھوک نگلتے ہوئے طلاق نامے کے افق سے اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ سامنے ایک ریوالور تانے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ گیا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ”یہ........ یہ کیا؟“

وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ”آصف نے میری چھٹی کر دی ہے۔ میں تمہاری چھٹی کر دوں گی........“

وہ پیچھے ہٹتے ہوتے بولا۔ ”کیا پاگل ہو گئی ہو؟ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ تمہیں میری سازش میں شریک سمجھ رہا ہے۔ میں اس کی غلط فہمی........“

”کیسے دور کرو گے؟ تم میرے بھائی ہو۔ وہ تمہاری بات کا کبھی یقین نہیں کرے گا۔

تم غیرت مند بھائی ہو نا؟ کیا یہ برداشت کر سکو گے کہ تمہاری بہن طلاق لے کر زندگی گزارے........؟“

”نہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔“

”اس لئے تمہیں مرجانا چاہئے۔“

”نہیں انجمن! ایک بھائی کے پیار کو اور اس کی قربانیوں کو سمجھو۔ میں نے تمہیں ڈاکٹر بنانے کے لئے بوبی کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ تمہاری خاطر کسی کا گھر داماد بن گیا۔ آصف کو بوبی سے چھین کر تمہارا گھر بسانے کے لئے میڈیکل رپورٹ کو بدلنے کا سنگین جرم کیا۔ کیا میری قربانیوں کا تم یہی صلہ دینا چاہتی ہو؟“

”جس گھر کی بنیاد غلط ہو۔ اس کی دیواریں جلد گر جاتی ہیں۔ بے شک قربانیاں دینے والے بھائیوں کے لئے بہنیں اپنی جان بھی دے دیتی ہیں لیکن وہی بہنیں اپنا گھر برباد کرنے والے بھائیوں کو کبھی معاف نہیں کرتیں۔ میں اپنی دنیا کے تمام مجرم بھائیوں کو اپنے ہاتھوں میں تمہارے خون کی لالی دکھانا چاہتی ہوں........“

ٹھائیں۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ بچہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

☆=========☆=========☆

بوبی نے آصف کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”نہیں آصف! وہ بچہ تمہارا ہے۔ اسے تمہارے سائے سے محروم نہیں رہنا چاہئے۔“

آصف نے کہا۔ ”وہ بچہ بھی میرا ہی تھا‘ جو تمہاری گود میں آیا تھا۔ مگر اس عورت نے اسے میرے سائے سے محروم کر دیا۔“

”مگر تم ایک کی سزا دوسرے بچے کو نہیں دے سکتے۔“

”آخر تم چاہتی کیا ہو؟“

وہ بڑے کرب سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”انصاف........ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ بڑوں کی سازشوں کو نہیں سمجھتے۔ اس بچے کے ساتھ انصاف کرو........“

”مگر اس کے لئے مجھے انجمن کے پاس جانا ہوگا اور میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

اسی وقت انہیں آواز سنائی دی۔ ”بوبی........ بوبی! تم کہاں ہو؟“

وہ دونوں چونک گئے۔ بوبی نے کہا۔ ”یہ انجمن کی آواز ہے۔ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ انجمن ایک چادر لپیٹے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بچہ نظر آرہا تھا۔

چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتی رہیں پھر انجمن نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آصف یہاں موجود ہے یا نہیں۔ میں تمہارے سامنے اپنی صفائی میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ میں نے تمہارے سہاگ پر ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ تقدیر نے مجھے جو کھیل کھلایا ہے۔ میں اس کھیل کے انجام کو پہنچ چکی ہوں۔ میں نے بھائی جان کو قتل کردیا ہے..........."

"قتل..........؟" بوبی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہاں۔ اب میں ایک لمبے سفر پر جا رہی ہوں مگر جانے سے پہلے آصف کی یہ امانت تمہیں سونپنے آئی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں تمہارے سوا کوئی اس کی حفاظت نہیں کرسکے گا۔ بوبی! میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ کیا مجھے معاف کردو گی؟"

بوبی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ انجمن نے آنسو بھری آنکھوں سے پوچھا۔ "کیا تم اس امانت کو آصف کے پاس پہنچا دو گی؟"

بوبی نے پوچھا۔ "مگر تم اسے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو؟"

انجمن جواب دینے کے بجائے بچے کو سینٹر ٹیبل پر رکھنے کے لئے جھکنے لگی۔ جھکنے کے دوران چادر کھل گئی۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نظر آرہی تھی۔

خواب گاہ کے دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے آصف کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ باہر دستک سنائی دے رہی تھی۔ پھر تحکمانہ آواز سنائی دی۔ "مسمات انجمن بیگم! دیر ہو رہی ہے۔ باہر آجاؤ۔"

وہ ہتھکڑی والے ہاتھوں کو سینے سے لگائے، بچے کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی پیچھے ہٹ رہی تھی۔ پھر وہ آصف کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بوبی کے پاس آرہا تھا۔

انجمن روتی ہوئی بولی۔ "میں نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا۔ میں اپنے بھائی کے جرم کی سزا پا رہی ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ جو نفرت تمہیں مجھ سے ہے، اس کا انتقام میرے بچے سے نہ لینا۔ میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔ بس میرے بچے کو قبول کرلو۔"

آصف سر جھکا کر بچے کے پاس آیا۔ پھر انجمن کو دیکھتے ہوئے بچے کو سینٹر ٹیبل سے

اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ وہ خوشی سے ہنسنے لگی۔ اپنی بدنصیبی پر رونے لگی۔ بچے کی سلامتی ہنسا رہی تھی اور تقدیر رلا رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مگر ممتا کا ماتم، دور تک سنائی دیتا رہا۔

تھوڑی دیر میں ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔ آصف اور بوبی ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ بولا۔ "میں اس سے انصاف کروں گا۔ یہ میرا ہے اور تم..........؟"

بوبی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے بچے کو دیکھا۔ اسے اپنی بات یاد آئی۔ ایک بار اس نے آصف سے کہا تھا۔ "میں جو ایک بچے کی آرزو کرتی ہوں تو میرے خوابوں میں اور خیالوں میں وہ آپ ہی کا بچہ ہوتا ہے۔ میں صرف اسی بچے کو سینے سے لگاؤں گی۔ جو آپ کا ہوگا۔ خواہ وہ مجھ سے ہو یا میری سوکن سے..........."

بوبی نے بچے کو آصف سے لے کر اپنے سینے سے لگالیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"میرے تمہارے اور انجمن کے سپنے الگ نہیں ہیں سب اپنے ہیں ان کی یہ تعبیر بھی اپنی ہے۔" وہ بچے کو چومنے لگی۔

☆==========☆==========☆

نیک نام

مرد بڑے باکمال ہوتے ہیں' ہمیشہ نیک نام رہتے ہیں۔
یہ زمانے کا دستور ہے کہ مرد ازل سے ہی نیک نام
اور عورت بدنام کہلاتی آ رہی ہے۔ ایک ایسے مرد
کی شرمناک کہانی جو خود کو نیک نام کہتا تھا۔

شہریار کو ملازمت کے سلسلے میں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا پڑتا تھا۔ کبھی چار چھ مہینے کے لئے لاہور میں رہ جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر دورے پر نکل جاتا تھا۔ جگہ بدلنے سے مزاج بھی بدل جاتا ہے۔ ذرا شوق بھی بدل جاتا ہے اور بہت کچھ بدلنے کے ساتھ محبت کو بھی بدلنے کا شوق جوان ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس کی گھر والی نہیں جانتی تھی۔

سلمیٰ کا دعویٰ تھا کہ اس کا مجازی خدا ایسا نہیں ہے۔ جیسے دوسرے مرد ہوا کرتے ہیں۔ شہریار کی بات دوسروں میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت ہی رعب اور دبدبے والا آفیسر تھا۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ ریلوے کا کوئی پُل تعمیر کرنا ہو یا کسی پُل کی مرمت لازمی ہو یا پھر ریلوے لائن کو کہیں نقصان پہنچا ہو تو وہ ایسی جگہ پہنچ جاتا تھا اور باقاعدہ پلاننگ کے مطابق تمام احکامات صادر کرتا تھا کہ کس طرح کام ہونا چاہیے۔ ان دنوں سیلاب کی وجہ سے ملیر کے پل کو کافی نقصان پہنچا تھا لہٰذا وہ اس پُل کا معائنہ کرنے اور اس کی تعمیر کے احکامات صادر کرنے کے لیے کراچی آیا ہوا تھا۔

ایسے وقت اس کے لیے ایک سیلون کار ریزرو ہوتی تھی۔ وہ جب بھی کسی شہر میں ڈیوٹی پر پہنچتا تھا تو وہ سیلون کار ریلوے کے شنٹنگ ایریا میں کہیں کھڑی رہتی تھی۔ اس کار کے اندر اس کی رہائش کے مکمل انتظامات ہوتے تھے۔ کھانے کے انتظامات کے علاوہ خدمت کے لیے نوکر اور عیاشی کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے ملک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہوا تھا اور شراب عام تھی۔ سیلون کار کے عیش کدے میں اس کے لیے شراب اور شباب سب کچھ مہیا ہو جاتا تھا۔

اگرچہ وہ خوب عیش کرتا تھا۔ ڈیوٹی بھی انجام دیتا تھا اور اپنے شوق بھی پورے کرتا تھا لیکن ادھر چار برسوں میں اس کا مزاج بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اگر کوئی اس کے پاس آنا بھی چاہتی تو وہ جھڑک دیتا تھا۔ دور بھاگتا تھا۔ صرف کبھی کبھی پی لیتا تھا اور پینے کے بعد کہیں دور کسی کی یاد میں کھو جاتا تھا حالانکہ یاد کرنے کے لیے اپنی بیوی بھی خاصی خوبصورت تھی' وفادار تھی' ہنس مکھ اور ملنسار تھی لیکن بے چاری بیوی تھی۔ بار بار یاد

آنے والی چیز نہیں تھی۔

لیکن سلمٰی نے اس بار شہریار کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”میں بھی کراچی چلوں گی۔ وہاں خوب شاپنگ کروں گی سیر کروں گی۔ پھر آپ کے ساتھ واپس آجاؤں گی۔“

اس نے بیوی کو خوش کرنے کے لیے اسے اور اپنے چار سال کے بیٹے امیر کو ساتھ لیا تھا۔ اس بار وہ بیوی بچے اس کے ساتھ سیلون کار میں موجود تھے جو کراچی کینٹ اسٹیشن کے باہر شنٹنگ ایریا میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ صبح ٹرالی میں بیٹھ کر ملیر برج تک آیا تھا۔ آنے سے پہلے سلمٰی سے کہہ دیا تھا کہ وہ بچے کو لے جا کر اپنی مرضی کے مطابق شاپنگ کرے لیکن دوپہر تک سیلون میں واپس آجائے۔ اس کی بھی واپسی اسی وقت ہو گی۔

دن کے ایک بجے وہ ملیر کے پُل سے ٹرالی میں بیٹھ کر واپس ہوا۔ راستے میں ملیر ہالٹ کے اسٹیشن پر ٹرالی کو روکنے کا حکم دیا۔ وہاں پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ ریلوے کا آفیسر تھا اور پلیٹ فارم پر ایسی غیر معمولی بھیڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ فوراً اس بھیڑ کی وجہ معلوم کی جائے۔

یہ حکم دینے کے بعد وہ خود بھی پلیٹ فارم پر آگیا۔ ایک ٹرالی مین نے آکر کہا۔ ”حضور! ایک پولیس والے نے ایک بدمعاش کو پکڑا ہے‘ وہ ایک ننھے سے بچے کو اٹھا کر کہیں جا رہا تھا۔“

اس کی بات سنتے ہی شہریار کے دل کو دھچکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے اس کا اپنا بیٹا کہیں گم ہو گیا ہو‘ کوئی اسے اٹھا کر لے جا رہا ہو۔ آئے دن اخبارات میں بچوں کے اغوا ہونے کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ سلمٰی کے ساتھ بچے کو جانے کی اجازت دے کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ان ماں بیٹے کو اکیلے کراچی جیسے بڑے شہر میں گھومنا نہیں چاہیے۔ اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ مڑ کر اپنی ٹرالی کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ تب ہی ایک ننھی سی آواز سنائی دی۔

”امی.......... امی.......... امی..........“

یہ آواز سنتے ہی اس کے قدموں میں زنجیر پڑ گئی۔ ایک دم ویسی ہی آواز تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ایک دم پلٹ گیا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر پولیس والے کی گود میں اس بچے کو دیکھنے لگا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا

اور وہ امی امی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ شہریار اس کا منہ دیکھنے کے لیے دوسری طرف لپک گیا۔ پھر اسے دیکھتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ”میرا بیٹا۔ میرا بچہ‘ امیر! امیر بیٹے! تم یہاں کہاں آگئے؟“

اس نے پولیس والے کی گود سے بچے کو چھین لیا۔ اسے کبھی سینے سے لگانے اور کبھی اِدھر اُدھر سے چومنے لگا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔ کون بدمعاش اسے اٹھا کر لے جا رہا تھا؟“

دوسرے پولیس والے نے ایک آدمی کے سر پر زور کی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہی بدمعاش تھا۔“

وہ بدمعاش دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ بولا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا میں اس بچے کو اٹھا کر نہیں لے جا رہا تھا بلکہ اس کے ماں باپ کو تلاش کر رہا تھا۔“

پولیس والے نے اسے ایک ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”بدمعاش تُو اسے سوسائٹی کے علاقے سے اٹھا کر لایا ہے اور ملیر ہالٹ میں آکر اس کے ماں باپ کو تلاش کر رہا تھا۔ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تجھ جیسے لوگوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پھر اس کی پٹائی کرنے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر اور ریلوے کے بہت سے ملازمین پہلے ہی موجود تھے اور شہریار کے آس پاس ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ اسے مبارکباد دے رہے تھے کہ بچہ اغوا ہونے سے پہلے ہی واپس مل گیا ہے۔ وہ اس بدمعاش کے خلاف قانونی کارروائی کے مشورے دے رہے تھے۔ شہریار نے کہا۔ ”میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو یہاں لاہور سے صرف چار دن کے لیے آیا ہوں‘ اگر قانونی الجھنوں میں پڑوں گا تو پھر تھانے کچہری کے چکر لگانے پڑیں گے اور میں یہاں پیشی کے دنوں حاضر نہیں ہو سکوں گا۔“

ایک سپاہی نے کہا۔ ”جناب! پہلے تو یہ ثابت ہونا چاہیے کہ یہ سچ مچ آپ کا ہی بیٹا ہے۔ آپ کو کوئی ثبوت تو دینا ہی ہو گا۔“

اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ارے ارے‘ یہ کیا بولتے ہو۔ تم انہیں نہیں جانتے .... یہ چیف انجینئر ہیں۔ ریلوے کے بڑے آفیسر ہیں۔ انہیں کون نہیں پہچانتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں‘ ہم سب اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ یہ ان کا ہی بچہ

ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ تھانے چل کر رپورٹ لکھائیے۔ وہاں اپنے دستخط کیجئے اپنا پتہ دیجئے۔ پھر اس بدمعاش کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔"

شہریار نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لوگ اس بدمعاش کو اچھی خاصی سزا خود ہی دے کر اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔ اگر قانونی کارروائی ہوئی تو میں بڑی الجھن میں پڑ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے شہریار نے اپنی اوپری جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر سپاہی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں آپس میں بانٹ لو۔"

وہ دو سپاہی تھے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم اس بدمعاش کی ایسی پٹائی کریں گے کہ یہ آئندہ کسی بچے کو اغوا نہیں کرے گا۔ جناب آپ تو بہت بڑے آفیسر ہیں۔ بڑے شریف آدمی ہیں' آپ جا سکتے ہیں۔ بچہ آپ کو مبارک ہو۔"

سو روپے کے ایک نوٹ نے بڑا کام دکھایا تھا۔ ایک دم سے قانون بدل گیا تھا۔ کسی تھانے میں رپورٹ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بار بار تھانے کچہری کے چکر لگانے کی مصیبت سے نجات مل گئی تھی۔ اگر یہی سو روپے کا نوٹ وہ اغوا کرنے والا مجرم پولیس والوں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تو قانون کے وہ رشوت خور محافظ بہت پہلے ہی اس مجرم کو بچے کے ساتھ فرار ہونے کا موقع دے چکے ہوتے۔ اچھے بھلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ رشوت دینے اور لینے کے باعث شریفوں سے زیادہ بدمعاشوں کا بھلا ہوتا ہے۔

وہ بچے کو سینے سے لگائے ٹرالی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرالی ریلوے لائن پر دوڑتی جا رہی تھی۔ دو ملازم اس ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے دوڑاتے ہوئے لے جا رہے تھے اور ہانپتے جا رہے تھے۔ تیز چلچلاتی ہوئی دھوپ میں وہ لوہے کی جلتی ہوئی پٹری پر ننگے پاؤں دوڑ رہے تھے۔ گورے صاحب لوگ اسی طرح دھوپ میں اور بارش میں چھتری کے نیچے ٹرالی پر بیٹھتے تھے اور برصغیر کے کالے آدمی ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے دوڑاتے ہوئے لے جاتے تھے۔ کبھی بارش کی وجہ سے لوہے کی پٹری پر پھسل کر زخمی ہوتے تھے اور کبھی جلتی ہوئی دھوپ میں لوہے کی گرم پٹری پر ننگے پاؤں دوڑتے تھے۔ وہ انگریز حاکم جا چکے تھے۔ اب پاکستانی افسران تھے اور اپنے ہی پاکستانی ملازمین کو وہی برطانوی انداز دکھا رہے تھے۔

لیکن ٹرالی پر بیٹھے ہوئے شہریار کو ان باتوں کا احساس نہیں تھا۔ چھتری کے سائے

میں یا ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھ کر مزدور کے پسینے کا احساس کرنا اچھا نہیں لگتا وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ سلمٰی کو بچے کی گمشدگی کا پتہ چلا ہو گا تو وہ بازاروں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہو گی۔ اس نے اپنے بال نوچ لیے ہوں گے' چیخ رہی ہو گی۔ تھانے میں رپورٹ کرائی ہو گی۔ ممتا کی تڑپ اتنی شدید ہو گی کہ اس کا کلیجہ پھٹ رہا ہو گا اچھا ہے ایسی عورتوں کو ایسی سزا ملنی ہی چاہیے۔

اس نے لاہور سے چلتے وقت سلمٰی کو سمجھا دیا تھا کہ کراچی میں اس کی خالہ زاد بہن رہتی ہے لہٰذا اسے بچے کے ساتھ وہیں اپنی بہن کے پاس رہنا چاہیے۔ وہاں بچے کی دیکھ بھال ہو گی۔ وہ شاپنگ کے لیے جایا کرے گی تو بچہ گھر میں رہا کرے گا لیکن شادی کرنے کے بعد عورت پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ ضد کرتی رہی کہ وہ سیلون کار ہیں شہریار کے ساتھ رہے گی۔ لہٰذا اب ساتھ رہنے کا نتیجہ اس کے سامنے آگیا تھا۔

امیر شہریار کے شانے پر سر رکھے کئی بار اپنی ماں کو آوازیں دے چکا تھا۔ بار بار امی امی کہہ رہا تھا۔ شہریار نے اسے تھپک تھپک کر کہا۔ "بیٹے! میں تمہارا پاپا ہوں' مجھ سے بھی تو باتیں کرو۔"

لیکن وہ ماں کو آوازیں دے رہا تھا۔ شہریار کو تعجب ہو رہا تھا کہ آج وہ صرف ماں کو کیوں یاد کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ ماں سے زیادہ باپ کو چاہتا تھا کبھی اس سے پوچھا جاتا تھا۔ بولو بیٹے! امی اچھی ہیں کہ پاپا اچھے ہیں؟ وہ فوراً ہی کہتا تھا پاپا اچھے ہیں لیکن اب پاپا کے سینے سے لگے ہوئے' شانے پر سر رکھے ہوئے صرف اپنی ماں کو یاد کر رہا تھا۔

وہ ٹرالی کینٹ کے شنٹنگ ایریا میں پہنچ کر رک گئی وہاں سے سیلون کار تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ڈیڈ لائن پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ امیر کو اپنی گود میں سنبھالتے ہوئے ٹرالی سے اتر کر اپنی سیلون کار کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا۔ سلمٰی تو ابھی واپس نہیں آئی ہو گی۔ بچے کو تلاش کرتی پھر رہی ہو گی۔ وہ بچے کو آیا کے پاس چھوڑ کر سلمٰی کی تلاش میں جائے گا۔ سیلون کار کی سیڑھی کے پاس ایک اردلی کھڑا ہوا تھا۔ دور سے اپنے صاحب کو آتا دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔ شہریار جب اس سیلون کار کے قریب پہنچا تو اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس کھڑکی سے سلمٰی کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

وہ ٹھٹک گیا۔ اس ہنسی کو غور سے سننے لگا۔ پھر پہچان گیا کہ واقعی سلمٰی ہی ہنس رہی ہے۔ اس نے دوبارہ غور کیا کہ وہ ہنسی خوشی کے جذبے سے ہنس رہی ہے یا بچے کی گمشدگی پر وہ پاگل ہو کر قہقہے لگا رہی ہے۔ کھڑکی سے آواز آ رہی تھی۔ "میرا لال! میرا

پیارا پیارا منا! یہ بندر میرے بیٹے کے لیے ہے اور یہ دیکھو یہ بھالو کیسے باجا بجاتا ہے۔ میں ابھی اپنے لال کو اس کا باجا سناتی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا سیلون کار کے دروازے پر آیا۔ اردلی نے اسے سلام کیا۔ وہ زینے پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا بیگم صاحبہ اندر موجود ہیں؟"

سوال کرتے وقت اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ سلمٰی کی ہنسی صاف پہچان گیا تھا کہ وہ موجود ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے۔ کیا ہمارا منا بھی ان کے ساتھ ہے؟"

اردلی نے ادب سے کہا۔ "جی صاحب! میرا بابا اندر موجود ہے۔ ابھی ہم اس کو گود میں کھلا رہے تھا۔ ابھی بیگم صاحب بازار سے آیا تو ہم اس کو اندر چھوڑ دیا۔"

شہریار حیران رہ گیا۔ وہ اپنی گود کے بچے کو دیکھنے لگا۔ اس کا بیٹا امیر اس کی گود میں تھا پھر اردلی کہہ رہا تھا کہ وہ سیلون کے اندر ہے۔ سلمٰی کی ہنسی سے اور باتوں سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ ان کا بیٹا امیر سیلون کے اندر ہے اور ایک امیر شہریار کی گود میں بھی تھا۔ یہ تو چکرا جانے والی بات تھی۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیلون کار کے اندر داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ سن کر سلمٰی کی ہنسی اور باتیں ذرا تھم گئیں۔ اس نے اندر پہنچ کر سیلون کا اندرونی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر اپنے بیٹے پر گئی' وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا اور بھالو کو باجا بجاتے ہوئے دیکھ کر تالی بجا رہا تھا۔

شہریار کی گود میں ایک بچہ دیکھ کر سلمٰی کا ہنستا ہوا چہرہ ساکت ہو گیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہاں سب پر سکتہ طاری ہو گیا صرف ایک بھالو باجا بجا رہا تھا۔ امیر کو سنبھالنے والی آیا بھی گم صم سی ہو کر شہریار کی گود کے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد سکتہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ کبھی اپنے بیٹے امیر کو دیکھتے تھے جو قالین پر کھلونوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی شہریار کے گود کے بچے کو دیکھتے تھے۔ دونوں کا چہرہ بالکل ایک جیسا تھا۔ ناک نقشہ ایک جیسا تھا کہ کہیں سے ذرا سا بھی فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ دونوں کا قد بھی ایک جیسا تھا' جسامت بھی ویسی ہی تھی۔

پھر سلمٰی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہریار کی طرف بڑھتے ہوئی بولی۔ "یہ ....یہ بچہ.......... آپ کو کہاں سے مل گیا؟"

شہریار نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تم یہ پوچھ رہی ہو کہ بچہ کہاں سے مل گیا۔ یہ نہیں پوچھ رہی ہو کہ یہ ہمارے بیٹے کا ہمشکل کیسے ہے؟ تمہیں بچے کے ملنے پر نہیں' اس کے

ہمشکل ہونے پر حیران ہونا چاہیے۔"

"آں' ہاں۔ میں حیران ہوں۔" سلمٰی پر بدحواسی طاری تھی۔ وہ کبھی قالین پر بیٹھے ہوئے امیر کو اور کبھی گود کے بچے کو دیکھ رہی تھی کہنے لگی۔ "میں خود حیران ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ادھر بھی میرا بیٹا ہے۔ ادھر بھی اپنا ہی بیٹا نظر آرہا ہے۔"

وہ بچے کو شہریار کی گود سے لیتے ہوئے بولی۔ "آپ جائیے غسل کر لیجئے۔ گرمی کی وجہ سے پسینے میں نہائے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے لیے کھانا نکالتی ہوں۔"

شہریار نے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کمال ہے' یہاں بچے کا اتنا اہم مسئلہ ہے اور تم مجھے نہانے اور کھانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ اگر ہم آنکھیں بند کر کے ان دونوں کو ایک جگہ بٹھا دیں اور پھر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ان میں سے ہمارا امیر کون ہے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "آپ ان باتوں کی فکر نہ کریں۔ میں اپنے بیٹے کو پہچان لوں گی۔"

شہریار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے پہچانو گی؟ کیا تم دونوں کو پہلے سے جانتی ہو؟"

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی۔ "آں' نہیں تو۔ میں بھلا دونوں کو کیسے پہچان سکتی ہوں۔ میں تو صرف اپنے بیٹے کو پہچانتی ہوں۔ پتہ نہیں آپ اسے کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ کچھ بتائیے تو سہی۔"

شہریار اسے بتانے لگا کہ وہ کس طرح اس اجنبی بچے تک پہنچا تھا اور اسے اپنا امیر سمجھ کر اس نے پولیس والوں کو سو روپے کی رشوت بھی دی تھی اور تھانے والوں سے کترا کر بچے کو ادھر لے آیا ہے پھر اس نے کہا۔ "اگر تھانے میں رپورٹ ہوتی تو یہ بچہ اپنے ماں باپ تک پہنچ جاتا۔ سو روپے کی رشوت بڑی مہنگی پڑی ہے۔ اب اس بچے کے ماں باپ کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔ تم کیا کہتی ہو؟"

شہریار نے سوال کیا۔ سلمٰی گم صم بیٹھی اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے سوال کرنے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسی طرح اس کے چہرے کو تکتی رہی' جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو' کہیں دور پہنچ گئی ہو اور اس اجنبی بچے کو لے کر کہیں بھٹک رہی ہو۔ شہریار نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیا سوچ رہی ہو؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"آں۔" وہ چونک گئی پھر بولی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"سلمٰی تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟"

"ہاں' ہاں۔ سب کچھ سن لیا ہے۔ آپ جلدی سے نہا دھو کر لباس بدل لیجیے' کھانا کھا لیجیے' پھر ہم کہیں تھانے میں جا کر اس بچے کے متعلق رپورٹ درج کرائیں گے۔ انشاء اللہ شام تک اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے۔ میں چار دن کے لیے یہاں آیا ہوں' اگر اس بچے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگا رہا تو ادھر ئیل کی مرمت کا کام نہیں ہو سکے گا۔ میرا لوکیشن پر موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

"آپ کھانا کھا کر ڈیوٹی پر چلے جائیے۔ میں بچے کو لے کر جاؤں گی تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گی اور انہیں یہاں سیلون کار کا پتہ لکھوا دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں جائے غسل کر لیجیے۔"

پھر وہ بچے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی پسینے میں نہا گیا ہے۔ میں گیلے کپڑے سے اس کا بدن پونچھ دیتی ہوں۔ اپنے امیر کا کوئی سا بھی لباس اسے پہنا دوں گی۔ بے بے! ذرا یہ کپڑا گیلا کر کے لے آنا۔"

آیا وہاں سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جانے لگی۔ شہریار نے کہا۔ "میں غسل نہیں کروں گا۔ پتہ نہیں یہ کراچی کا موسم کیسا ہے۔ اتنے خشک موسم میں بھی غسل کرو تو زکام ہو جاتا ہے۔"

آیا ایک کپڑے کو بھگو کر لے آئی۔ سلمٰی بچے کو گود سے اتار کر قالین پر بٹھاتے ہوئے اس کی بنیان اتارنے لگی۔ جیسے ہی بنیان اتری شہریار پھر اس بچے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس بچے کے دائیں بازو پر ایک بڑا سا زخم کا نشان تھا۔ اس نے جلدی سے جھک کر قالین پر بیٹھتے ہوئے سلمٰی سے کہا۔ "یہ دیکھو' اس کے بازو پر بھی ویسا ہی نشان ہے جیسا ہمارے امیر کے بازو پر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہمارے امیر کے بائیں بازو پر یہ نشان ہے اور اس کے دائیں بازو پر۔"

ایسا کہتے ہی وہ ایک دم سے چونک کر خلا میں گھورنے لگا چند لمحوں کے بعد اس نے دھیرے دھیرے نظریں جھکا کر سلمٰی کو دیکھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ شہریار نے آہستگی سے کہا۔ "سلمٰی! یہ دو نشان اگر ملا دیے جائیں۔ دونوں بچوں کے بازوؤں کو جوڑ دیا جائے تو ایسا لگے گا جیسے یہ جڑواں بچے ہیں ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔"

سلمٰی ایک دم سے پیچھے ہٹ کر تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے

ہیں۔ نہیں میں نے تو .... میں نے تو صرف امیر کو جنم دیا ہے۔"

شہریار نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو ایسے پیچھے ہٹ رہی ہو جیسے میں تمہیں مارنے آ رہا ہوں بھئی میں تو ایک قاعدے کی بات کہہ رہا ہوں۔ کسی بھی ڈاکٹر کو یہ دو نشان دکھائے جائیں تو یہی کہے گا کہ یہ جڑواں بچے ہیں اور انہیں آپریشن کے ذریعے الگ الگ کیا گیا ہے۔"

سلمٰی نے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ننگے بدن کو گیلے کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولی۔ "یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایسا نشان ہو تو بچے جڑواں ہوں۔ یہ کسی چوٹ کا نشان ہو گا۔ بس یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے بچے کی طرح اس کے بازو پر بھی ایک نشان بن گیا ہے۔"

شہریار قالین پر سے اٹھ کر پھر برتھ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ہم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بچے کو اس کے ماں باپ تک پہنچانے کا انتظام کرنا چاہیے۔"

"میں ابھی اس بچے کو لے جاؤں گی اور تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گی۔"

"تم اتنی دھوپ میں کہاں جاؤ گی؟ ایسا کرو۔ امیر کی ایک تصویر مجھے دے دو۔ میں یہاں ریلوے پولیس انسپکٹر سے جا کر ملتا ہوں اور اسے پوری روداد سناتا ہوں۔ اس بچے کے لباس کے بارے میں بتا دوں گا کہ اس نے ایک سفید نیکر اور سرخ بنیان پہنی ہوئی ہے۔ اپنے امیر کی وہ تصویر پیش کر دوں گا۔ وہ پولیس انسپکٹر تمام تھانے والوں سے رابطہ قائم کرے گا۔ یقیناً اس بچے کے ماں باپ نے کہیں نہ کہیں پر رپورٹ درج کرائی ہو گی۔ یہ تھانے والے آپس کے رابطے سے بچے کو یہاں آ کر لے جائیں گے۔ ہمیں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی۔"

آیا نے کہا۔ "ٹھیک ہے بی بی جی! آپ صاحب کو امیر کی تصویر نکال کر دے دیں۔ میں اس بچے کو کپڑے پہنا دیتی ہوں۔"

سلمٰی بچے کو بار بار اپنی گود میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر اس کا بدن پونچھ رہی تھی جیسے وہ اپنے ہی گوشت پوست کا حصہ ہو۔ اس نے کہا۔ "میں بچے کو خود ہی کپڑے پہنا دوں گی۔ تم ایسا کرو میرا سوٹ کیس کھول کر امیر کا کوئی اچھا سا لباس نکال کر اس بچے کے لیے دو۔ وہیں ایک البم رکھی ہوئی ہے۔ وہ صاحب کو دے دو۔ یہ اس میں سے کوئی تصویر پسند کر کے نکال لیں گے۔"

آیا نے حکم کی تعمیل کی۔ سوٹ کیس کھول کر البم نکالی اور اسے صاحب کے حوالے

کر دیا۔ پھر امیر کا ایک جوڑا نکال کر سلمیٰ کو دے دیا۔ سلمیٰ کہہ رہی تھی۔ "پتہ نہیں اس کی ماں کا کیاں حال ہو گا۔ بے چاری رو رو کر پریشان ہو گی۔"

شہریار نے البم میں سے امیر کی ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "یہی میں راستے میں سوچتا آرہا تھا کہ ہمارا امیر اغوا ہوا ہے اور تم اسے تلاش کرتی ہوئی لوگوں سے پوچھتی پھر رہی ہو گی اور پاگلوں کی طرح چیخ چلا رہی ہو گی۔ اب تم نہ سہی' کوئی دوسری ماں ہے جو اپنے اس بچے کے لیے پریشان ہو گی۔ پتہ نہیں اپنا کیا حال کیا ہو گا۔ میں ریلوے پولیس انسپکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔"

وہ تصویر لے کر سیلون کار سے باہر آگیا۔ باہر اردلی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پھر اٹینشن ہو کر سلام کیا۔ شہریار اسے نظرانداز کرتے ہوئے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف جانے لگا۔ جب وہ پلیٹ فارم کے قریب پہنچا تو ادھر سے ایک سپاہی آرہا تھا۔ سپاہی نے شہریار کو دیکھ کر سلام کیا۔ اس نے پوچھا۔ "تمہارے انسپکٹر صاحب ہیں؟"

سپاہی نے کہا۔ "جی نہیں' صاحب! وہ ایک کیس کے سلسلے میں صدر کی طرف گئے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد واپس آجائیں گے۔"

شہریار نے کچھ سوچا۔ پھر واپس پلٹ کر سیلون کی طرف جانے لگا۔ اب وہ ایک گھنٹے بعد انسپکٹر سے نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اسے ملیر برج کی طرف ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اب سلمیٰ ہی انسپکٹر سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ وہ سیلون کار کے قریب پہنچا تو اردلی وہاں موجود نہیں تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے سلمیٰ کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس بات کو سنتے ہی ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ کان لگا کر سننے لگا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "بے بے! کبھی کبھی اندازے سے کہی ہوئی بات درست ہو جاتی ہے۔ تمہارے صاحب نے بھی اندازے سے درست کہہ دیا کہ دونوں جڑواں بچے تھے۔ آپریشن کے ذریعے الگ کیے گئے ہیں لیکن ان کی بات درست نکلنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو اسے جھٹلا دیا ہے۔"

آیا کی آواز سنائی دی۔ "ٹھیک ہے' آپ نے صاحب کی بات کو جھٹلا دیا لیکن اس بچے کو جلدی رخصت کر دینا چاہیے۔ نہیں تو بھید کھل جائے گا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ جسے سنتے ہی شہریار کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے آج تک دھوکے میں رکھا گیا۔ سلمیٰ

نے یہ بات کیوں چھپائی؟ وہ جب ملیر ہالٹ کے اسٹیشن سے اس دوسرے بچے کو گود میں اٹھا کر لا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں کتنی پریشان ہو گی۔ اسے ڈھونڈ رہی ہو گی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خود ہی اسے اس کی ماں کے پاس لے آیا ہے' اس بچے کی کوئی دوسری ماں نہیں تھی۔ جو ہے وہی سلمیٰ ہے لیکن یہ کیا بھید ہے؟ اگر وہ جڑواں بچوں کا باپ بنا تھا تو اس سے اس کے دوسرے بیٹے کو کیوں چھپایا گیا؟

وہ اپنی سوچ کی گرفت سے نکل کر ان کی باتیں پھر توجہ سے سننے لگا۔ سلمیٰ کہہ رہی تھی۔ "میں خود ہی اس بچے کو یہاں سے لے جانا چاہتی تھی۔ یہ جس کی امانت ہے اسے ڈھونڈ کر اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔"

آیا نے کہا۔ "مگر صاحب' امیر بابا کی تصویر لے کر چلے گئے ہیں بی بی جی! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ اگر تھانے والوں نے پتہ چلا لیا اور اس عورت تک پہنچ گئے تو پھر صاحب کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ دونوں بچے ان کے نہیں ہیں۔ وہ ان بچوں کے باپ نہیں ہیں۔"

آیا کی یہ بات ایسی دھماکہ خیز تھی کہ شہریار ایک دم سے کانپ کر رہ گیا۔ اس کا سر ایک دم سے پھٹا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا وجود پھٹ پڑے گا۔ اس کے چیتھڑے چیتھڑے ہو جائیں گے اور وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ ایسی مکروہ دنیا سے نجات حاصل کر لے گا جہاں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے سلمیٰ پر ایسا اندھا اعتماد کیا تھا اور وہ تھی کہ چار سال سے ایک ناجائز بچے کو اس کی گود میں کھلا رہی تھی۔

اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ دانت پیسنے لگا۔ غصے اور جنون میں بس ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ابھی اندر جائے اور سلمیٰ کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دے۔ اسے اتنی سفاکی سے قتل کرے کہ وہ منظر دیکھ کر پھر دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد سے بے وفائی نہ کر سکے۔

آدمی سوچتا بہت کچھ ہے لیکن سوچی ہوئی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔ شہریار نے کبھی اپنے ہاتھوں سے ایک مرغی بھی ذبح نہیں کی تھی۔ پھر وہ سلمیٰ کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ غصے کی گرمی نکالنے کے لیے کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔ کوئی کمزور یا شریف آدمی جب کسی کو ہلاک نہیں کر سکتا تو خیال ہی خیال میں اپنے دشمن کو بار بار قتل کرتا ہے۔ بار بار اسے مرتے ہوئے دیکھتا ہے اور آسودگی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اپنے اندر کا غبار نکالتا رہتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر اندر جاتا تو غصے کی حالت میں

سلمیٰ کو مار بیٹھتا۔ پھر چیخ چیخ کر گالیاں دینا شروع کر دیتا اس طرح اس کی پوزیشن بگڑ جاتی۔ وہ ریلوے کا اتنا بڑا آفیسر تھا۔ اس کے ماتحت طرح طرح کی باتیں بناتے۔ پھر بات کا بتنگڑ بنتا' جو بات ابھی سیلون کار کی چار دیواری میں چھپی ہوئی ہے وہ عام ہو جاتی اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اف۔ کتنی گندی گالی پڑتی۔ اسے ایک مرد برداشت نہیں کر سکتا۔

وہ وہاں سے دور جانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سلمیٰ اس کی بیوی نہیں بلکہ غلاظت کا ڈھیر ہے۔ اگر وہ قریب رہے گا۔ سیلون کار کے اندر جائے گا تو بدبو سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ مختلف لائنوں کو عبور کرتے ہوئے دور ڈیڈ لائن پر کھڑی ٹرالی کی طرف جانے لگا۔

سلمیٰ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اور آیا اس کے سامنے کھڑی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس کی نظر دور جاتے ہوئے شہریار پر پڑی۔ اس نے کہا۔ "بی بی جی! صاحب تو انسپکٹر سے ملنے گئے تھے۔ یہ تو وہاں ٹرالی کی طرف جا رہے ہیں۔"

سلمیٰ نے ادھر دیکھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ "یہ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟ انہوں نے تو غسل بھی نہیں کیا۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ آرام کرنے کے بعد یہ ڈیوٹی پر جاتے ہیں۔ مگر ابھی سے جا کر ٹرالی پر بیٹھ رہے ہیں۔"

اچانک وہ سہم گئی۔ دل میں چور تھا اس لیے سوچنے لگی۔ کیا یہ انسپکٹر سے ملنے کے لیے پلیٹ فارم پر نہیں گئے تھے۔ یہیں کھڑے ہوئے تھے؟ کیا انہوں نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ شاید یہی بات ہے۔ یہیں سے وہ سیدھے ٹرالی کی طرف گئے ہیں۔

وہ آیا سے بولی۔ "اردلی سے جا کر کہو کہ وہ صاحب کو یہاں بلا کر لائے۔"

"بی بی جی! وہ تو کھانے کی چھٹی لے کر گیا ہے۔ کیا میں خود جا کر بلا لاؤں؟"

"پوچھتی کیا ہو۔ جاتی کیوں نہیں؟"

آیا جلدی سے باہر چلی گئی۔ سلمیٰ جھنجلاہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایک تو دوسرے بچے کی آمد نے ہی اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پرانی باتیں تازہ کر دی تھیں اور یہ خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ جو بات چار برس سے چھپی ہوئی ہے وہ اچانک ہی کھل نہ جائے۔

آیا ریل کی پٹڑیوں پر سے گزرتی ہوئی ٹرالی کے پاس پہنچی۔ شہریار نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر غرا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ سہم کر بولی۔ "صاحب جی! بی بی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔" اس نے اسے زور سے ڈانٹا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹی۔ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ شہریار نے کہا۔ "ٹھہرو۔"

وہ قریب آ کر ٹرالی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ شہریار نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر امیر کی تصویر نکالی' اسے دیکھا۔ وہ بچہ جو چار سال سے اس کی گود میں کھیل رہا تھا' جس سے اسے دلی اور روحانی لگاؤ تھا۔ صبح شام اسے پیار کرتا تھا اب وہ بچہ بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔ اپنا تو لگتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک گناہ تھا جو اس کی گود میں پالنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے نفرت سے تصویر کو دیکھا پھر اس کے دو ٹکڑے کر کے آیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنی بی بی جی کو دے دو۔"

آیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے کے انداز میں تصویر کے ٹکڑوں کو لیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اسی لیے وہ چلتے وقت ڈگمگا رہی تھی۔ ایک جگہ ریل کی پٹڑی پر اس نے ٹھوکر بھی کھائی مگر سنبھل گئی۔ شہریار نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔ "حرام زادی اپنی بی بی جی کی ہمراز ہے۔"

پھر وہ یک بیک مسکرایا۔ بڑی ظالم مسکراہٹ تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس نے تصویر کے دو ٹکڑے کر کے سلمیٰ کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ایک عورت کو منہ سے گالی دینے اور ہاتھ سے مارنے کے بجائے اس کو ذہنی اذیتیں پہنچائی جائیں تو اس سے بڑا انتقام کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے تصویر کو ٹکڑے کر کے بہت ہی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب سلمیٰ تلملائے گی۔

ایک بے وفا' مکار اور فریبی عورت سے انتقام لینے کا ایک راستہ سجھائی دیا۔ وہ راستہ اور روشن ہوتا گیا۔ اس کے دماغ میں بات آتی گئی۔ "اب اس عورت کو نہ تو کچھ بھلا برا کہا جائے اور نہ ہی غصے میں آ کر اسے طلاق دی جائے۔ اسے ذہنی اذیتیں پہنچائی جائیں۔ یہ میری بیوی بن کر رہے گی لیکن میں اسے تمام عمر ذلیل کرتا رہوں گا۔ کیسے اسے ذلیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ مجھے بہت اطمینان سے سوچنا چاہیے۔"

ہاں' اس نے سوچا۔ ٹھیک تو ہے۔ اس نے ایک ناجائز بچے کو میرا بیٹا بنایا ہے۔ اب میں باپ بن کر ہی اس بیٹے پر سختی کروں گا۔ میں باپ ہوں مجھے حق پہنچتا ہے کہ اپنے بیٹے سے جیسا بھی سلوک کروں دیکھوں گا کہ اب یہ کیا کرتی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا اور کبھی کبھی چور نظروں سے سیلون کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی

دیر میں ہی سلمیٰ نظر آئی۔ وہ دروازہ کھول کر سیڑھی سے اترتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔ اسی وقت ایک مال گاڑی اپنی سُست رفتاری سے چلتی ہوئی اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ گویا اس کا راستہ روک دیا۔ اب وہ بے چین ہو گی کہ وہ مال گاڑی جلدی گزرے تو فوراً اس کے پاس پہنچ کر پوچھے کہ بچے کا کیا قصور ہے؟ اس کی تصویر پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی لیکن ابھی یہ سوال کرنے میں بہت دیر تھی۔ مال گاڑی کا ایک ایک ویگن بہت سُست رفتاری سے گزرتا جا رہا تھا۔ شہریار کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کس قدر بے چین ہو گی۔ اندر سے کیسے تڑپ رہی ہو گی اور تصویر کے پھاڑے جانے پر اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ سب کچھ وہ سمجھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

مال گاڑی بہت لمبی تھی۔ گزرتی جا رہی تھی۔ مگر اس کا آخری سرا نہیں آرہا تھا۔ وہ ٹرالی کی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ خود کس قدر بے چین ہے خود ہی سلمیٰ کا انتظار کر رہا ہے۔ آنے والی کی بے چینی اور تڑپ .... دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے کے اندر آگ لگا کر اپنی آگ کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ مال گاڑی گزر گئی۔ سلمیٰ ریل کی پٹریوں کو عبور کرتی ہوئی ٹرالی کے سامنے آئی۔ وہ دور سے آتے وقت نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ ایک بار سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ قریب پہنچ کر بھی اس کا سر جھکا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر تصویر کے دو ٹکڑے دکھائے۔ آہستگی سے پوچھا۔ "یہ آپ نے کیا کیا..........؟"

وہ اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر نے بھی آپریشن کے ذریعے دو کئے تھے۔ میں نے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ کیا یہ پسند نہیں آئے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"وہی جو تم چھپانا چاہتی ہو۔ چھپاتی آرہی ہو۔ تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت قتل کر دوں۔ مگر افسوس کہ میں ایک شریف آدمی ہوں' قاتل یا بدمعاش نہیں ہوں۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

"دیکھئے۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ہمارے منے کی ہمارے امیر کی قسم کھا کر کہتی ہو کہ ...."

"بس آگے اسے ہمارا نہ کہنا۔ اب تم نے اسے میرا کہا تو میں تمہارے منہ پر تھوک

دوں گا۔"

سلمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایک دم سے موم کے بجائے پتھر بن گئی۔ اس کے چہرے پر سختی آگئی۔ وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ مجھ پر تھوکیں گے؟ کیا آپ نے مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے؟ میں ایک شریف خاندان کی عزت ہوں۔ میں آپ کو سمجھاتی ہوں کہ کسی بات کا غصہ ہے تو اسے آپ اپنے تک محدود رکھیں۔ آئندہ آپ نے ذلیل کرنے والی بات مجھ سے کی تو میں ایک عورت ہوں۔ اپنی انا کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کروں گی۔"

"دیکھو' میں کوئی معمولی پوزیشن کا آدمی نہیں ہوں۔ اس ملک کے چاروں طرف جہاں جہاں ریلوے لائن جاتی ہے وہاں تک میری عزت اور شہرت ہے' میرے نام کا رعب اور دبدبہ سب لوگوں پر طاری رہتا ہے۔ میں تمہاری جیسی عورت سے یوں سرِ عام منہ لگ کر اپنی عزت کو خاک میں ملانا نہیں چاہتا۔ تم سے کہتا ہوں کہ ان دونوں بچوں کو لے کر اپنی بہن کے ہاں چلی جاؤ اور وہیں رہ کر اس خوش نصیب کو تلاش کرو جو تمہارے بچوں کا باپ ہے۔"

وہ ایک دم سے چیخ کر بولی۔ "میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ سمجھے؟"

وہ ایک جھٹکے سے ٹرالی پر یوں چڑھ گئی جیسے اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھنا چاہتی ہو۔ پھر بولی۔ "آپ ان بچوں کے باپ نہیں ہیں۔ میں ان بچوں کی ماں نہیں ہوں۔ سمجھے؟"

وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سلمیٰ ایک دم سے چیخنے لگے گی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "یہ' یہ تم چیخ کیوں رہی ہو۔ ارے یہاں ریلوے کے ملازمین سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ میری پوزیشن کا خیال کرو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

"کوئی آپ کو گالی دے تو کیا آپ خاموش رہیں گے؟"

"نہیں۔ مگر تم آرام سے باتیں کرو۔"

"اگر آپ کو عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو اُدھر چلئے۔"

سلمیٰ نے انگلی اٹھا کر سیلون کار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی ٹرالی سے اتر گیا۔ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے ادھر جانے لگا۔ شریف اور عزت دار آدمی بڑا مجبور ہوتا ہے۔ اپنی عورت پر بھی دھونس نہیں جما سکتا۔ عورت ذرا بھی تیز طرار ہو تو گھر کی چار دیواری کے باہر اس کی عزت کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دیتی ہے۔

سیلون کار کے اندر پہنچتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "آپ نے مجھے اتنی

بُری گالی دی تھی کہ میں چیخنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا آپ کی عزت میری عزت نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے باہر ایسی حرکت کی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔"

شہریار نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر آیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا اب بھی اپنی بی بی جی کی ہمراز بن کر رہنا ہے۔ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

وہ فوراً پلٹ کر سرونٹ کلاس کی طرف دروازہ کھول کر جانے لگی۔ اس نے کہا۔ "ٹھہرو۔ اکیلی کہاں جا رہی ہو ان سؤر کے بچوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

سلمٰی نے تلملا کر کہا۔ "آپ کیسی گندی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ننھے معصوم بچے آرام سے یہاں قالین پر کھیل رہے ہیں۔ آپ کا کیا بگڑ رہا ہے۔ بے بے۔ تم یہاں سے جاؤ۔"

آیا دروازہ کھول کر سرونٹ کلاس کی طرف گئی پھر دروازے کو دوسری طرف سے بند کر دیا۔ شہریار نے بچوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے بھی نہیں ہیں۔ تم کسی دوسری عورت کو ان بچوں کی ماں بنا دو گی۔ تمہارے پاس پہلے سے اس سلسلے میں کوئی دلچسپ کہانی تیار ہو گی۔ جسے تم سناؤ گی اور میں بھی سن لوں گا لیکن اتنا یاد رکھو کہ تمہارے پاس ایک بات کا جواب کبھی نہیں ہو گا اور وہ یہ کہ تم چار برس تک دھوکہ کیوں دیتی رہیں اگر تم پارسا ہو' اگر تم نے میرے اعتماد کو بحال رکھا ہے تو چار سال تک مجھے بیوقوف کیوں بنایا گیا ہے۔"

"خدا گواہ ہے کہ میں نے بیوقوف نہیں بنایا بلکہ بہت مجبوری کی حالت میں اس بات کو آپ سے چھپائے رکھا۔"

"میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ وہ مجبوری کیا ہے؟"

"آپ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ اتنے عرصے تک بات چھپی رہی اگر بتانا ہوتا تو میں چار برس پہلے بتا چکی ہوتی۔"

"میرے سامنے باتیں نہ بناؤ۔ اگر تم سچی اور بے حیا نہیں ہو تو اپنی سچائی اور پارسائی ثابت کرنے کے لیے تمہیں بتانا پڑے گا۔"

وہ بولی۔ "ہماری شادی کو چھ برس ہو گئے۔ آج تک آپ انصاف سے کہئے۔ کبھی میں نے کوئی بات جھوٹ کہی ہے؟ کبھی آپ کو کسی سلسلے میں دھوکہ دیا ہے' کبھی آپ سے اپنی یا اپنے گھر والوں کی کوئی بات چھپائی ہے؟ جو بات ہوتی ہے۔ صاف صاف سامنے بیان

کر دیتی ہوں لیکن یہ بات جو چھپائی گئی۔ اس میں آپ ہی کی بھلائی ہے.........."

"جہنم میں گئی بھلائی سچ کیا ہے' یہ میں سن کر ہی رہوں گا۔"

وہ چند لمحوں تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ میں بانجھ ہوں۔ میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے ان دو میں سے ایک بچے کو گود لے لیا۔"

"یہ تم سیدھا اور صاف جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا تم بھول گئیں کہ تمہارا ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا تھا اور ڈاکٹری رپورٹ یہ تھی کہ تم ماں بن سکتی ہو۔ میں تم سے کہتا تھا کہ ہمارے گھر میں بیٹا پیدا ہو گا۔ میرا نام لیوا ہو گا۔ میں اسے اتنا پیار دوں گا۔ اتنا پیار دوں گا کہ تم بھی باپ بیٹے کی محبت سے جلنے لگو گی۔ تم میری دیوانگی کو سمجھتی تھیں۔ پھر تم نے کسی دوسرے کی اولاد کو گود کیوں لیا۔ تم نے انتظار کیوں نہیں کیا' کیا تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی تھی؟"

سلمٰی نے بڑے کرب سے اور بڑے اضطراب سے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔ "آپ بہت مجبور کر رہے ہیں تو مجھے بولنا پڑتا ہے۔ اب جو سچ ہے وہ سن لیجئے۔ یہ سچ آپ کو بہت کڑوا لگے گا۔ آپ کو یاد ہے کہ شادی کے ڈیڑھ سال بعد آپ کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپ ہسپتال میں ایک مہینے تک پڑے رہے۔ آپ کا آپریشن کیا گیا تھا۔ اسی وقت ڈاکٹر نے آپ کے ابا جان سے کہا تھا کہ آپ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ڈاکٹر یہ بات مجھ سے نہ چھپاتا۔"

"ڈاکٹر آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا لیکن ابا جان نے اسے روک دیا۔ انہوں نے کہا۔ شہریار بہت جذباتی انسان ہے بہت حساس ہے۔ اسے اولاد کا بہت شوق ہے' وہ کئی بار باتوں ہی باتوں میں اس خوشی کا اظہار کر چکا ہے وہ بیٹے کو خیالوں میں دیکھتا ہے اور پیار کرتا رہتا ہے۔ اگر اسے یہ المیہ سنا دیا جائے کہ ہمیشہ کے لیے وہ اولاد سے محروم ہو گیا ہے تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جائے گا۔ بڑے بوڑھے جانتے ہیں کہ کون سی بات کس سے چھپانا چاہیے اور کسے بتانا چاہیے۔ میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ ساری عمر آپ کے ساتھ رہنا ہے اور ساری عمر اولاد کا سپنا دیکھنا تھا۔ اس سے پہلے ہی ابا جان نے مجھے سمجھا دیا بیٹی اولاد کے سپنے نہ دیکھو۔ بہت زیادہ خواہش ہو تو کبھی کسی کی اولاد کو گود لے لیا جائے گا اور شہریار کو اس کی خبر نہیں ہونے دی جائے گی۔ یہ شہریار کے

حق میں بہتر ہی ہو گا۔"

وہ ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا جب وہ چپ ہوئی تو اس نے پوچھا۔ "بکواس کر چکیں۔ تم کتنی چالاک اور مکار ہو۔ اب ابا جان اس دنیا میں نہیں رہے کہ تمہارے جھوٹ کا پول کھولیں گے۔ تم نے میرے مرحوم باپ کے کاندھے پر جھوٹ کی بندوق رکھ کر چلا دی اور سمجھ لیا کہ میں اس پر یقین کر لوں گا۔ کوئی ایسا گواہ پیش کرو جو زندہ ہو جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔"

"میں کوئی ایسا گواہ پیش نہیں کر سکتی۔ بس یہ ایک آیا ہے جو ہمارے ساتھ اس راز میں شریک رہی ہے اس کے علاوہ ان بچوں کی ماں ہے۔"

"تم بھی عورت ہو اور جسے گواہی کے لیے پیش کرو گی وہ بھی عورت ہو گی۔ میں اب تمہاری ذات پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ان بچوں کا باپ کون ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

سلمٰی چپ رہی۔ شہریار نے اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو۔ مجھے بتاؤ۔ جب تم ان بچوں کو جانتی ہو تو ان کے باپ کو بھی جانتی ہو گی۔ کون ہے ان کا باپ؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں جانتی۔"

"بہت خوب۔ ان کی ماں کو جانتی ہو۔ ان کے باپ کو نہیں جانتیں۔ وہ کیسی عورت تھی جس نے ان کے باپ سے اجازت لیے بغیر ایک بچہ تمہارے حوالے کر دیا؟"

"وہ بات یہ ہے کہ۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "کہ وہ کنواری ماں تھی ...."

"کنواری ماں؟" وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر برتھ پر بیٹھ گیا۔ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ ماں بن گئی تھی اور تم مجھے ایک ناجائز بچے کا باپ بنائے ہوئے ہو۔ میں اب تک حرامی بچے کو گود میں لیتا رہا ہوں اور اسے پیار کرتا رہا ہوں۔ تم کیسی ذلیل عورت ہو۔"

وہ چیخ پڑی۔ "آپ میرے ساتھ اپنے مرحوم ابا جان کو بھی گالی دے رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس بچے کو گود لینے میں ان کا مشورہ بھی شامل تھا۔"

وہ ذرا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے خالی نظروں سے تکنے لگا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے مگر وہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی باتیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ ایک تو اس بات کا ہی ثبوت نہیں تھا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہی ہے اور اس

کے مرحوم باپ کا حوالہ دے کر اپنی سچائی ثابت کرنے میں کہاں تک دیانت دار ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ بچے ناجائز تھے۔ یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بولی۔ "گناہ کرنے والے گنہگاروں کو سزا ملنی چاہیے ان معصوم بچوں نے کیا بگاڑا ہے۔ انہوں نے تو نہیں کہا تھا کہ گناہ کیا جائے اور انہیں پیدا کیا جائے؟"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر ان بچوں کو گود لیا گیا اور ان کی پرورش کی گئی تو گناہ اور زیادہ پھلے پھولے گا۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "تو پھر مار دیجئے ان دونوں کو گولی۔"

"میں کون ہوتا ہوں گولی مارنے والا۔ انہیں میرے پاس سے لے جاؤ۔ اب ان میں سے کوئی بھی ہمارے پاس نہیں رہے گا۔"

"آپ کیسی ظالمانہ باتیں کر رہے ہیں۔ یہ وہی امیر ہے۔ یہ وہی بیٹا ہے۔ جسے آپ اپنے پاس سلاتے تھے۔ میں اپنے پاس سلانا چاہتی تھی تو آپ جھگڑا کرتے تھے۔ آپ صبح اٹھ کر اس کے بغیر ناشتہ نہیں کرتے تھے۔ شام کو آتے ہی پہلے امیر کو پوچھتے تھے پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے تھے۔ آپ بیٹے کو اس قدر چاہتے تھے۔ اب حقیقت معلوم ہوتے ہی کیا آنکھیں بھی بدل گئیں۔ کیا آدمی ایسا طوطا چشم ہوتا ہے؟ ذرا سی بات پر دل کی گہرائیوں سے قائم ہونے والے رشتے پل کی پل میں بالکل مُردہ ہو جاتے ہیں؟"

"مجھ سے بحث مت کرو۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ میرے خاندان کا نام صرف میری اولاد سے چلے گا۔ میں یہاں سے لاہور پہنچنے کے بعد اپنا ڈاکٹری معائنہ کراؤں گا اور اس بات کی تصدیق کروں گا کہ میں باپ بن سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر نہیں بن سکتا تو ہم اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کی اولاد کو گود لے سکتے ہیں اپنی اولاد کا شوق پورا کر سکتے ہیں لیکن میں کسی ناجائز اولاد کو اپنے گھر میں رہنے کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔"

سلمٰی نے پوچھا۔ "شادی کے بعد ہم نے جو گھر بسایا ہے اس گھر میں کیا میری کوئی بات نہیں چلے گی؟"

"کوئی غلط بات نہیں چلے گی۔"

"یہ کیسے معلوم ہو گا کہ ہم میں سے کون غلط ہے اور کون درست کہہ رہا ہے۔ آپ کسی بھی صاحبِ عقل سے پوچھیں۔ وہ معصوم بچوں کی حمایت کرے گا۔"

"میں نے کہہ دیا نا کہ میں اس سلسلے میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ شام کو جب واپس آؤں تو یہ بچے یہاں نہ رہیں۔ انہیں

ان کی ماں کے پاس پہنچا دو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان کی ماں کا پتہ ٹھکانہ نہیں جانتی ہوں۔ اگر وہ شام تک نہیں ملی تو میں انہیں کہاں لے کر جاؤں گی۔"

"کہیں بھی لے جاؤ۔ یہاں تمہاری خالہ زاد بہن کا گھر ہے۔ ایک طرح سے تمہارا میکہ ہے۔ جب تک بچے اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچیں اس وقت تک تم ان بچوں کے ساتھ اپنی بہن کے ہاں رہو......"

وہ باہر جانے کے لئے دروازے تک گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولا۔ "میں ریلوے کی طرف سے ایک سال کی ٹریننگ کے لئے فرانس چلا گیا تھا۔ اس دوران تم نے یہ چکر چلا دیا۔ مجھے ایک ناجائز بچے کا باپ بنا دیا۔ میں پھر ایک طویل مدت کے لئے تمہیں تمہاری بہن کے پاس رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ وہاں رہ کر پھر کوئی چکر چلاؤ اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کرو لیکن اب میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ اسی وقت فرش پر بیٹھے ہوئے امیر نے کہا۔ "پاپا ٹاٹا۔"

شہریا ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ بے اختیار اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا نہیں ہے بلکہ غلاظت کی پوٹ ہے۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ دروازے کو ایک دھماکے سے بند کر دیا۔ سلمٰی نے بھیگی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے بچے کی طرف بڑھی۔ امیر نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "امی۔ پاپا نے ٹاٹا نہیں کیا۔"

وہ اسے گود میں لے کر چومتے ہوئے بولی۔ "بیٹا وہ ٹاٹا کر چکے ہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

☆==========☆==========☆

ڈاکٹر وحیدہ انجم کلینک کے چیمبر میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ روز صبح دس بجے سے بارہ بجے تک مریضوں کو دیکھنے کے بعد بارہ بجے سے ایک بجے تک چیمبر میں تنہا بیٹھی رہتی تھی۔ کسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ روز انتظار کرتی تھی لیکن وہ نہیں آتا تھا۔

تقریباً پانچ برس پہلے وہ ٹھیک دن کے بارہ بجے اس کے پاس مریض بن کر آیا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے مریضہ بنا کر کہیں گم ہو گیا تھا۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ دن کے بارہ بجے کا وقت زوال کا وقت ہوتا ہے۔ یہ وقت بڑا ہی منحوس ہوتا ہے۔ ایسے وقت نہ کسی کا اعتبار کرنا چاہیے' نہ کسی سے کچھ پانے کی توقع کرنی چاہیے۔ نہ جانے والے کی واپسی کا

انتظار کرنا چاہیے۔ ایسے وقت کسی کو کچھ نہیں ملتا لیکن وہ ایسے ہی وقت کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ حالات کبھی اسے ایسے ہی وقت اس کی طرف لا سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے کہ وہ نہیں آتا تھا لیکن اس وقت یادیں آتی تھیں اور بڑے زور و شور سے آتی تھیں۔ گزرے ہوئے دنوں کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ یہ یادیں ان دنوں سے شروع ہوئی تھیں۔ جب وہ پریکٹیکل کی کلاسیں اٹینڈ کرتی تھی اور ہسپتال میں جا کر مریضوں کو دیکھتی تھی۔ اس کے لیے اور اس کی ساتھی لڑکیوں کے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں مریض آتے تھے۔ اپنا نام لکھاتے اور اپنا چیک اپ کراتے تھے۔ پھر وہ ان کے لیے دوائیں تجویز کرتی تھی۔

ایسے ہی وقت وہ مریض آیا تھا۔ وہ کبھی کسی سے آنکھیں ملا کر باتیں نہیں کرتی تھی۔ نظریں جھکی جھکی رہتی تھیں۔ کسی مریض کی نبض تھام کر بھی وہ سر جھکائے سوال کرتی رہتی تھی لیکن اس آنے والے کو جب اس نے ایک دو بار دیکھا تو کئی بار اس کی نظریں ادھر اٹھ گئیں وہ بے حد خوبرو تھا۔ اس کی شخصیت اور اس کے چہرے پر مردانگی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کبھی کبھی بخار رہتا ہے اور سر میں بھی درد ہوتا ہے۔"

تو وحیدہ نے اس کی نبض تھام کر اسی طرح سر جھکائے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

"میرا نام نیکنام ہے۔"

وحیدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "یہ تو عجیب نام ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا نیکنام ہونا عجیب بات ہے؟"

وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ نیکنامی تو اچھی چیز ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے ایسا عجیب نام پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"آپ پہلے کبھی کب سن سکتی تھیں؟ آپ کی عمر ہی کتنی ہے۔ جب آپ بڑی ہو کر دنیا دیکھیں گی تو اور بھی عجیب و غریب نام سنیں گی۔ میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کا نام جھاڑو ہے۔ کیا آپ نے ایسا نام کبھی سنا ہے؟"

اس کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ اسے ہنستے دیکھ کر دوسرے مریضوں کو دیکھنے والی لڑکیاں چونک گئیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ارے دیکھو' پتھر کو جونک لگ گئی ہے۔ آج یہ ہنس رہی ہے۔"

دوسری نے کہا۔ "نظر نہ لگاؤ ورنہ پھر رونے والا منہ بنائے گی۔"

سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ایک لڑکی نے نیکنام کے پاس آکر پوچھا۔ ”کیوں مسٹر آپ کوئی ماہر نفسیات ہیں؟ آپ نے اس پتھر کو کیسے ہنسا دیا؟“

وہ بولا ”دیکھئے‘ ڈاکٹر صاحبہ‘ پھول آپ جیسے پھولوں کے درمیان نہیں کھل سکتا۔ پھول کی خاصیت ہے کہ وہ کانٹوں میں رہ کر کھلتا ہے۔ میں ایک کانٹا ہوں۔ شاید ان کے احساسات میں کہیں چبھ گیا ہوں۔ انہیں گدگدی ہوئی اور یہ ہنس پڑیں۔“

اس کی بات سن کر وحیدہ ایک دم سے جھینپ گئی تھی۔ اس کی نظریں جو جھکیں تو پھر اٹھ نہ سکیں وہ بڑی گہری بات کہہ گیا تھا۔ اس بات کو اس نے بڑی دور تک سمجھا تھا۔ پتہ نہیں لڑکیوں نے کیا سمجھا ہو۔

اس نے بڑی مشکلوں سے شرماتے‘ لجاتے ہوئے اس نیکنام کا معائنہ کیا۔ اس کے لیے نسخہ لکھا۔ اس دوران وہ کچھ نہ کچھ بولتا رہا اور خوب بولتا رہا۔ جاتے وقت اس نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے آج تک کسی لیڈی ڈاکٹر کو اپنے مریض سے یوں شرماتے نہیں دیکھا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ چونکہ بھلا نہیں سکوں گا اس لیے پھر آؤں گا۔ مجھے یاد رکھنا۔“

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یقین ہوا کہ وہ سچ مچ کانٹا ہے‘ جو اس کے احساسات کے کسی نازک حصے میں چبھتا جا رہا ہے اور وہ رہ رہ کر آپ شرماتی جا رہی ہے ہوسٹل میں لڑکیوں نے اسے خوب چھیڑا۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ بے اختیار سوچنے کے دوران مسکرا دیتی تھی۔ پہلے وہ تنہائی پسند تھی لیکن اب لڑکیوں میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ خصوصاً ان کا چھیڑنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رات کو جب ہوسٹل کے کمرے میں وہ تنہا بستر پر لیٹی تو تنہائی بھی اچھی لگی۔ کمرے میں وہی وہ دکھائی دے رہا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر زوال کے وقت آیا۔ اس بار وحیدہ نے شرمانے کے باوجود اس سے کچھ باتیں کیں۔ بات کچھ آگے بڑھی۔ تیسرے دن وحیدہ نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بننے کے بعد کراچی جیسے شہر میں پریکٹس کرنا چاہتی ہے اس کے والدین خانپور میں رہتے ہیں۔ وہ لاہور میں پچھلے پانچ برس سے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اب یہ آخری سال ختم ہونے کو آرہا ہے۔ پہلے وہ خانپور جائے گی۔ پھر کراچی جا کر کسی اچھی جگہ اپنا ذاتی کلینک قائم کرے گی۔

اگلی ملاقات میں وحیدہ نے کہا۔ ”میں اپنا نام بتا چکی ہوں۔ اب آپ اپنا صحیح نام بتائیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کا نام نیکنام ہے۔“

”گویا کہ تم مجھے نیکنام نام نہیں سمجھتی ہو۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”آپ مذاق نہ کریں۔ کیا مجھے آپ کا نام جاننے کا حق نہیں ہے؟“

”تم نے حق کی بات کہی۔ میرا نام حقدار شاہ ہے۔“

”واہ‘ جو میں نے کہا۔ اسی پر آپ نے اپنا نام رکھ لیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“

”یقین کرو۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میرا نام حقدار شاہ ہے۔ اب یہ اتنا مشکل نام ہے کہ حلق سے ادا کرنا پڑتا ہے نیکنام کتنا سیدھا سادا سا ہے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔ بائی دی وے تم صبح ہوسٹل سے کتنے بجے نکلتی ہو؟“

”آٹھ بجے۔“

دوسرے دن وہ ٹھیک آٹھ بجے ہوسٹل کے سامنے کھڑا ہوا نظر آیا۔ وحیدہ انجم خوشی سے کھِل گئی۔ کوئی ایسا چاہنے والا تھا کہ صبح اٹھ کر اس کے دروازے پر چلا آتا تھا۔ یقیناً رات کو اسی کے متعلق سوچتا ہو گا۔ دن بھی اسے ہی یاد کرتے ہوئے گزرتا ہو گا۔ وہ قریب آکر بولی۔ ”ارے‘ آپ یہاں کھڑے ہیں؟“

”اور نہیں تو کیا۔ میں نے وقت یوں ہی تو نہیں پوچھا تھا۔ آؤ میں تمہیں ہسپتال تک چھوڑ دوں۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ وحیدہ نے کہا۔ ”آپ نے میرا نام بھی معلوم کر لیا اور پتہ ٹھکانہ بھی۔ اب آپ بتائیں کہ کہاں رہتے ہیں۔“

”میں جہاں رہتا ہوں وہاں تمہیں کبھی لے جا نہیں سکوں گا۔ کیونکہ میرا اپنا گھر نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا مکان ہے جسے ہم پانچ آدمیوں نے مشترکہ طور پر کرائے پر حاصل کیا ہے۔ ہم جیسے ہوسٹل والی زندگی گزارتے ہیں۔“

”آپ کرتے کیا ہیں؟“

”اس ملک کے ہزاروں‘ لاکھوں گریجویٹ نوجوانوں کی طرح ملازمت تلاش کرتا ہوں۔“

”آپ کے والدین‘ رشتہ دار کہاں ہیں؟“

”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہاں دور کے رشتہ دار ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ نہ وہ میرے وقت پر کام آتے ہیں نہ میں ان کے کسی وقت پر جا کر

حاضری دیتا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ بالکل تنہا ہوں۔"

شام کو ہوسٹل میں لڑکیاں اسے کرید کرید کر پوچھا کرتی تھیں۔ "بتاؤ آج کیا باتیں ہوئیں؟"

جب وحیدہ نے ساری بات بتا دی تو ایک لڑکی نے کہا۔ "میری مانو تو یہ آدمی بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے۔"

دوسری لڑکی نے کہا۔ "ہاں' پہلے تو اپنے آپ کو نیکنام بتایا میں تو کہتی ہوں کوئی بدنام ہے۔"

تیسری لڑکی نے کہا۔ "اپنا ٹھکانہ ایسی جگہ بتایا ہے کہ وحیدہ وہاں جا کر دیکھ بھی نہیں سکتی وہاں تو سارے مرد ہوں گے' یہ بے چاری اس کے بارے میں کیسے کھوج لگا سکتی ہے؟"

وحیدہ انجم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان کے بارے میں کھوج لگاتی پھروں۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "ارے تو کیا یونہی بات بڑھا دو گی۔ آخر اس سے دلچسپی لے رہی ہو تو بات شادی تک پہنچے گی۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہونا چاہئیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

ایک اور لڑکی نے کہا۔ "عشق کا بھوت سوار ہو تو دوسروں کی تمام باتیں غلط ہوتی ہیں۔ ایسے وقت کسی بھی محبت کرنے والے کو سمجھانا بڑی حماقت ہے۔"

یہ سچ ہے کہ حماقت کرنے کے دوران اپنی حماقت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے' جس کے ذریعے ہم نقصان اٹھانے سے پہلے اپنی حماقتوں کو سمجھ سکیں۔ ایک عقل ہے جسے ہم استعمال کرنا نہیں جانتے۔ وحیدہ انجم خود اپنا تجزیہ نہ کر سکی کہ وہ چند ہفتوں میں اس سے بے تکلف کیسے ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ سیرو تفریح کے لیے جانے لگی۔ پہلے وہ اپنا بہت سا وقت لائبریری میں بیٹھ کر معلوماتی کتابیں پڑھنے میں گزارتی تھی۔ اب وہ لائبریری کا راستہ بھول گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ہسپتال میں پریکٹیکل کی کلاسیں اٹینڈ کرنے جاتی اور نیکنام آکر اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور وہ کشاں کشاں چلی جاتی۔ اس کے ساتھ فلمیں بھی دیکھنے لگی۔ پہلے وہ بالکونی میں بیٹھ کر فلمیں دیکھتے تھے۔ پھر باکس میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ لاہور کے سینما ہال میں عشق کرنے والوں کے لیے یہ بڑی سہولت ہے کہ باکس میں تنہائی نصیب ہو جاتی ہے۔

اب وحیدہ انجم زمین پر نہیں چلتی تھی۔ ہواؤں میں اڑتی تھی۔ ہوسٹل کی تنہائیوں میں صرف اپنے نیکنام کو یاد کرتی تھی اس کے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔ رات سے صبح بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ جب صبح ہوتی تو اس کا انتظار ہوتا۔ جب وہ آجاتا تو تنہائی کی تمنا ہوتی جب تنہائی ملتی تو ایک گھر بسانے کی آرزو مچلنے لگتی۔ اب وہ ہر بار اس سے پوچھتی تھی کہ کب تک ملازمت مل جائے گی۔ کب اپنا گھر بساؤ گے اور وہ مجبوری بیان کرتا تھا۔ پھر وہ خود ہی منصوبے بناتی' ہم کراچی چلیں گے۔ وہاں میں اپنا کلینک قائم کروں گی پھر تمہیں اطمینان سے روزگار تلاش کرنے کا موقع ملے گا۔ جب تک تمہیں ملازمت نہیں ملے گی۔ میں اس وقت تک اپنے گھر کے تمام اخراجات برداشت کروں گی۔

وہ خواب دکھاتا تھا۔ یہ تعبیر بتاتی تھی۔ تعبیر تک پہنچنے کے لیے نیکنام نے کبھی عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ ہمیشہ وعدے کرتا رہا کہ جلد ہی ملازمت کرے گا یا پھر اس کے ساتھ کراچی جائے گا۔ جب ہوسٹل سے جانے میں چار ماہ رہ گئے تو وحیدہ نے کہا۔ "ہم یہاں سے خانپور جائیں گے۔ امی اور ابو سے آپ کا تعارف کراؤں گی۔ وہیں ہماری شادی ہو گی۔ پھر ہم کراچی چلے جائیں گے۔"

ایک دن نیکنام اس سے رخصت ہو کر گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ اس نے ایک دن انتظار کیا۔ دوسرے دن بھی اس کی راہ دیکھی۔ جب وہ نہیں آیا تو بے چین ہو گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ سمن آباد میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک مکان میں رہتا ہے۔ وہ دوست ایسے ہیں کہ وہاں وحیدہ کا جانا مناسب نہیں ہے لیکن سمن آباد بہت بڑی جگہ ہے۔ وہ اسے کہاں جا کر تلاش کرتی؟

ہر آنے والا دن اسے مایوس کرنے لگا۔ اس کی محبت کا مذاق اڑانے لگا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی محبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ ایک کہانی پڑھ رہی تھی۔ ادھوری محبت کے عنوان سے کہانی ختم ہو گئی۔ کردار بھی ختم ہو گیا اور وہ ادھوری محبت کے انجام پر سوچتی ہی رہ گئی ہے۔

لیکن کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو شروع ہوئی تھی۔ ایک دن سویرے ناشتہ کرنے کے بعد اس کا دل گھبرانے لگا۔ جی متلانے لگا۔ آخر قے کرنے کے بعد اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ تب اسے پتہ چلا کہ دن میں تارے کیسے نظر آتے ہیں۔

اگر وہ موجود ہوتا تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوتی۔ فوراً ہی نکاح پڑھا لیا جاتا۔ وہ ایک سے دو ہوتے اور دو سے فوراً تین ہو جاتے کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکتا۔

وہ پریشان ہو گئی۔ اب کیا کرے؟ کسے اپنا دکھڑا سنائے؟ کس کی ہمدردی حاصل کرے؟ کون اسے صحیح مشورہ دے گا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ دماغ نے چپکے سے کہا۔ "جو غلطی ہو چکی ہے اسے منظرِ عام پر آنے سے پہلے ختم کر دو۔ غلطی آخر غلطی ہوتی ہے۔ اسے دنیا والے قبول نہیں کریں گے۔"

وہ اپنے دماغ کے اس مشورے پر تلملا گئی۔ دل نہیں مانتا تھا کہ ایسا کرے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے نیکنام کو چاہا تھا۔ اس سے محبت کی تھی۔ جیسے عبادت کرتی رہی ہو۔ وہ اس کی محبت کی نشانی کو مٹانا نہیں چاہتی تھی۔ نیکنام کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج نہیں آیا ہے تو کل ضرور آئے گا۔ جب کل آیا تو پھر اس نے یہی سوچا کہ کل ضرور آئے گا۔

کتنے ہی کل گزرنے لگے۔ ایک ماہ بعد اسے ڈاک کے ذریعے لفافہ ملا۔ اس لفافے ایک کونے پر نیکنام کا نام دیکھ کر وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اس نے لفافے کو چاک کیا۔ پھر اس میں تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ نیکنام نے لکھا تھا۔ "میری جان وحیدہ انجم بڑی مصیبتوں سے گزرتا رہا ہوں۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ اس حادثے میں میری ٹانگ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بہرحال اب میری ٹانگ ٹھیک ہو گئی ہے۔ میں ایک ماہ تک ہسپتال میں رہ کر واپس آیا ہوں لیکن ابھی گھر سے نہیں نکلتا ہوں جس دن نکلوں گا سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔ میں ہسپتال میں اس قدر پریشان رہا کہ تمہیں اطلاع نہ دے سکا اور ان دنوں جہاں ہوں' وہاں تمہیں بلا نہیں سکتا۔ جہاں اتنے دنوں تم نے صبر کر لیا ہے۔ کچھ روز اور انتظار کر لو۔ میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ فقط تمہارا اپنا نیکنام۔"

خط پڑھ کر دل اور دماغ کا سارا بوجھ اتر گیا۔ ایک اندیشہ تھا کہ نیکنام نے محبت کا فریب دیا ہے اور اس سے کھیل کر اسے بھلا دیا ہے۔ اب وہ اندیشہ مٹ گیا تھا۔ اب وہ محبت سے جھنجلا رہی تھی کہ اس نے ہسپتال میں رہنے کے دوران اطلاع کیوں نہیں دی۔ وہ خود ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس سے زیادہ اس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دن رات اس کے بستر سے لگی بیٹھی رہتی۔ اس کی خدمت کرتی مگر نیکنام نے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔

وہ محبت سے سوچتی رہی اور دن گزارتی رہی۔ اس نے لکھا تھا کہ چند روز میں آئے گا۔ وہ چند روز گزر گئے۔ پھر چند ہفتے بھی گزرنے لگے۔ پھر دل گھبرانے لگا۔ پھر وسوسے جنم لینے لگے۔ آخر اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اسے تلاش کرنے کے لیے نکل پڑی۔

اسے ڈھونڈ نکالنے کا یہ راستہ تھا کہ وہ لاہور کے تمام ہسپتالوں میں جاتی اور یہ معلوم کرتی کہ پچھلے ایک ماہ تک ایسا کون مریض آیا تھا جس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ تمام ہسپتالوں میں گئی۔ تین دن تک ایک ایک ہسپتال سے گزر کر آ گئی۔ ہر جگہ یہی پتہ چلا کہ ایسا کوئی مریض ہسپتال میں نہیں آیا تھا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ جب اسے دھوکہ ہی دینا تھا اور خط لکھنے کے بعد دوبارہ نہیں ملنا تھا تو اس نے خط لکھا ہی کیوں؟ کیا وہ پھر کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب تو نیکنام سے زیادہ اس بچے کے متعلق سوچنا تھا۔ دو ماہ گزر چکے تھے۔ پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ اب فیصلہ کرنا تھا کہ اس بچے کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟ کیا اسے مٹا دے؟ نہیں نہیں' اس کے اندر کی عورت چیخنے لگتی تھی۔ وہ بچہ محبت کی نشانی تھا۔ وہ محبت کرنے والا کبھی واپس آ کر ناراض ہو جاتا اس کا انتظار کیوں نہیں کیا؟ تب وہ کیا جواب دے گی۔

اس کا دل یہی سمجھاتا تھا کہ وہ پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ نہ آنا ہوتا تو وہ خط کبھی نہ لکھتا۔ اسی شش و پنج میں تین ماہ گزر گئے۔ کچھ لڑکیوں کو شبہ ہونے لگا وہ اپنے طور پر پوری کوشش کر رہی تھی کہ راز کھلنے نہ پائے۔ یوں بھی تین ماہ میں اتنی وضاحت سے راز عیاں نہیں ہوتا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی پھر اس نے چار ماہ پورے ہونے سے پہلے ہی ہوسٹل چھوڑ دیا۔ خانپور جانے کے ارادے سے نکل گئی۔ اپنی عزیز ترین سہیلی کو سمجھایا کہ اگر نیکنام آئے تو وہ فوراً اسے خانپور کے پتے پر بھیج دے یا خانپور اسے ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دے دے اس نے فون کا نمبر بھی بتا دیا۔ نیکنام سے دوسری بار ملنے کے تمام انتظامات کر کے وہ خانپور چلی آئی۔ وہ والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ ماں باپ اسے بے حد چاہتے تھے اس کی ہر ضد پوری کرتے تھے۔ اس کی ضد پر اسے اتنا پڑھایا لکھایا تھا اس کے ضد کرنے پر نیکنام سے اس کی شادی بھی کر دی جاتی لیکن جب شادی سے پہلے ہی وہ عورت کے مقام سے گر گئی تو ماں باپ سکتے میں رہ گئے۔ پہلے تو تمام دن کچھ بول نہ سکے۔ کچھ کھا نہ سکے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سانس بھی نہیں لے رہے ہوں۔ یہ اتنے بڑے صدمے کی بات تھی جسے اولاد نہیں سمجھتی۔ ماں باپ بڑے اعتماد سے تعلیم دلانے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجتے ہیں لیکن ان کے اعتماد کو جب ٹھیس پہنچتی ہے اور جب ان کی عزت کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے تو اس کے بعد خون کے رشتے برائے نام رہ جاتے ہیں۔ اعتماد کا مضبوط رشتہ ہمیشہ

کے لیے مرجاتا ہے۔

اس کا باپ بہت ہی سنجیدہ اور متحمل مزاج شخص تھا۔ اس نے شام کو بڑی نرمی سے کہا۔ "بیٹی ہم نے اعتماد کے ساتھ تمہیں پانچ برس تک لاہور کے ہوسٹل میں رکھا' تم تنہا یہاں سے جاتی تھیں اور تنہا ہم سے ملنے آتی تھیں۔ ہمارے پاس پڑوس والوں نے ہمیں سمجھایا' کہ جوان لڑکیوں پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے لیکن ہم نے تم پر بھروسہ کیا ہمیں کیا' دنیا کے ہر ماں باپ کو اپنی اولاد معصوم اور فرشتہ نظر آتی ہے۔ ہم اسی معصوم اور فرشتہ سیرت وحیدہ انجم کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ واپس چلی جاؤ اور جب دوبارہ آؤ تو اس طرح کہ ہماری عزت بحال رہے تمہارے آس پاس گناہ کا سایہ نہ ہو پھر ہم تمہیں قبول کرلیں گے۔"

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے ٹھکرائی جائے گی۔ کیوں ٹھکرائی گئی؟ کس کی وجہ سے ٹھکرائی گئی؟ کہاں ہے وہ جس نے اسے اس مقام پر لا کر چھوڑ دیا۔ اب اسے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ صرف نیکنام کے لیے نہیں تھی۔ اپنے ماں باپ کے لیے بھی کچھ تھی۔ اس کی وجہ سے ماں باپ کی نیکنامی تھی۔ اب وہ نیکنامی نیکنام کو دے کر ہمیشہ کے لیے بدنام ہو رہی تھی۔ اپنے والدین کی اور اپنے خاندان کی برسوں کی عزت کو خاک میں ملا رہی تھی۔

اس نے والدین کے سامنے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔ "میں واپس جا رہی ہوں بدنامی کو ہمیشہ کے لیے چھپا کر لاؤں گی یا بدنامی کے ساتھ خود بھی چھپ جاؤں گی۔ آپ لوگوں کو منہ نہیں دکھاؤں گی۔"

رات کے ایک بجے وہ ٹرین میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن آئی تو ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے بیٹی کو ایک اٹیچی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں دس ہزار روپے ہیں کم پڑیں تو اور منگوا لینا۔ مگر بیٹا میں تیری زندگی چاہتی ہوں۔ تجھے ضرور واپس آنا چاہیے تیرے ابا نے کراچی کے سب سے مہنگے علاقے سوسائٹی میں تیرے لیے پلاٹ لیا ہے۔ وہاں تیرے لیے ایک چھوٹا سا ہسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ کم از کم دس لاکھ روپے وہ اس ہسپتال میں خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ تُو کہے گی تو اور زیادہ اخراجات برداشت کریں گے۔ تیری خوشی کے لیے ہم سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر بیٹا بڑھاپے میں اپنی جدائی کا داغ نہ دینا۔ واپس چلی آنا۔ میری آنکھیں تیری راہ تکتی رہیں گی۔"

ایسا کہتے کہتے بوڑھی آنکھیں رونے لگیں۔ وحیدہ نے ماں کے آنسوؤں کو اپنے

دوپٹے کے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "امی آپ پریشان نہ ہوں میں بالکل ٹھیک ٹھاک واپس آجاؤں گی۔"

"بیٹی میں تجھے ہر حال میں اپنے کلیجے سے لگا سکتی ہوں آخر ماں ہوں نا۔ پر تیرے ابا عزت کی خاطر مر سکتے ہیں مگر بے عزتی برداشت کر کے تجھے قبول نہیں کر سکیں گے۔ میری مجبوریوں کو سمجھ' یہ کبھی نہ سوچنا کہ ہم نے تجھے برے وقت میں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ لاہور میں زیادہ پریشان ہو تو مجھے ٹیلی گرام دینا۔ میں تیرے پاس آجاؤں گی۔"

ٹرین آئی.......... وہ فرسٹ کلاس کے ایک چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئی۔ دونوں ماں بیٹی کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر تھوڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر آنسو بہاتے ہوئے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئیں۔ جب ٹرین چل پڑی تب وحیدہ نے محسوس کیا کہ وہ کمپارٹمنٹ میں تنہا نہیں ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ایک برتھ پر ایک حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نظریں ملتے ہی اس عورت نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر بولی۔ "میرا نام سلمیٰ ہے۔ بیگم سلمیٰ شہریار' میں لاہور جا رہی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اچانک ہی وحیدہ کا سر چکرانے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر جواب دیے بغیر وہاں سے پلٹ کر ٹوائلٹ میں چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹوائلٹ کے اندر ابکائیاں لے رہی تھی۔ بڑے اچھے وقت طبیعت بگڑی تھی۔ اپنا نام بتانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب وہ قے کرتے وقت سوچ رہی تھی کہ اپنا نام نہیں بتانا چاہیے۔ نام بتائے گی تو ٹھکانہ بتانا ہو گا۔ پھر ٹھکانے سے بات چلے گی تو ماں باپ کے نام تک پہنچے گی۔ اس کے بعد وہ نام بدنامی تک پہنچے گا۔ اسے اب گمنام رہنا چاہیے۔ اس نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا یہی ہے کہ اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ اب اس کی اپنی کوئی ذات نہیں رہی ہے۔ جب تک فریب خوردہ محبت کی نشانی اس کے وجود میں پرورش پا رہی ہے اس وقت تک وہ دنیا کی بدترین اور ذلیل عورت ہے جو اپنے پیدا کرنے والے والدین کے لیے صرف بدنامیاں لاتی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی۔ اپنے آپ کو کوس رہی تھی گالیاں دے رہی تھی اور اس طرح اپنے نام کو مٹانے کا حوصلہ کر رہی تھی۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو اس خاتون نے ایک تولیہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لو بہن! منہ ہاتھ پونچھ لو۔ معلوم ہتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم ماں بننے والی ہو؟"

وحیدہ نے ایک دم چونک کر گھبرا کر یوں دیکھا جیسے اس عورت نے پتھر مارا ہو.......... اس نے اسے سہارا دے کر برتھ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں بدنصیب اولاد سے محروم ہوں لیکن اولاد والیوں کے کام تو آسکتی ہوں مجھے اپنی بڑی بہن سمجھو۔"

اچانک ہی وحیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی وہ اندر ہی اندر حیران ہوتی رہی کہ یہ یک بیک آنسو کیسے ابل پڑے؟ کیوں رو رہی ہے۔ ایک اجنبی عورت کے سامنے کیوں اپنا راز کھول رہی ہے؟ ارے' یہ کیسے آنسو ہوتے ہیں جو بے ارادہ آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں؟ وہ کتنی مجبور تھی۔ اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھی۔ خود نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔

کبھی کوئی بات اچانک نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے بہت سی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔ وہ لاہور میں تین ماہ تک نیکنام کا انتظار کرتی رہی۔ محبت کے بھروسے پر بہلتی رہی۔ وہ نہ آیا تو کچھ امیدیں لے کر اپنے والدین کے پاس گئی مگر وہاں بھی اسے محبت نہیں ملی۔ وہاں سے ٹھکرائے جانے کے بعد وہ پھر لاہور کی طرف جا رہی تھی۔ اتنی پریشانیاں اٹھانے کے بعد پہلی بار کسی عورت نے اسے تسلی دی تھی اور اسے کہا تھا کہ اسے اپنی بہن سمجھے۔ بس اسی ایک بات پر بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے۔

سلمیٰ اس کے پاس برتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے ہولے ہولے تھپک کر تسلیاں دے رہی تھی۔ "بہن چپ ہو جاؤ۔ کیوں رو رہی ہو' کیا شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ خاتون جو تمہیں رخصت کرنے آئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ تمہاری امی ہوں گی۔ تم مجھے اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے کام آنا چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھے بالکل اپنا سمجھو۔"

سلمیٰ کی ایک ایک بات اسے رلا رہی تھی۔ سوال تھا۔ کیا شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ ارے' شوہر تھا ہی کہاں وہ تو ہرجائی تھا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ خاتون جو رخصت کرنے آئی تھیں کیا اس کی ماں تھیں؟ ماں کہاں تھیں' باپ کہاں تھا۔ دنیا کا کوئی رشتہ کہاں تھا؟ ہر رشتہ اپنے لیے ایک عزت اور ایک مرتبہ رکھتا ہے اور وہ ساری عزت اور مرتبے کھو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا جو خاتون اس پر اتنی مہربان ہے اور اس کے کام آنا چاہتی ہے۔ وہ اسے کیا بتائے۔ کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔

وہ روتی جا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ ایک اجنبی خاتون کے سامنے نہیں

کھلے گی۔ ادھر سلمیٰ میں جادو بھرا ہوا تھا۔ اس کی باتوں میں عجیب محبت اور ممتا تھی وحیدہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے ماں اسٹیشن سے رخصت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ اسے بتا رہی ہے کہ سب چھوٹ سکتے ہیں۔ ماں نہیں چھوٹ سکتی۔ ماں چھوٹ بھی جائے تو ممتا نہیں چھوٹ سکتی اور ممتا تو کسی بھی عورت میں ہو سکتی ہے کسی اجنبی ہمسفر میں بھی ہو سکتی ہے۔

سلمیٰ اس کے پاس سے اٹھ کر اپنی برتھ کی طرف گئی۔ پھر اوپری برتھ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ٹفن کیریئر نکالا۔ اسے کھول کر پھر کوئی چیز نکالی اور ایک چھوٹی سی' ننھی سی پیالی میں اسے لے کر وحیدہ کے پاس آئی۔ پاس بیٹھ کر بولی۔ "یہ لو۔ اسے ذرا چکھ لو۔ تمہاری یہی خواہش ہو گی۔"

وحیدہ نے کن انکھیوں سے اس ننھی سی پیالی کو دیکھا تو دل مچل گیا۔ وہ اس کے لیے اچار لے کر آئی تھی۔ اس نے پیالی کو یوں لپک لیا جیسے برسوں کی بھوکی ہو۔ آہاہا۔ کھٹا کھٹا' چٹخارے دار اچار ایسا تھا کہ دیکھنے اور سننے والوں کے منہ میں بھی پانی آجاتا ہے وہ ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر چوسنے لگی۔ سلمیٰ نے بڑی محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں رونا کیوں آتا ہے؟ کیا اپنے میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے؟"

وہ اچار چکھتے چکھتے رک گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ایک اجنبی ہمسفر کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنی ماں کے پاس نہیں ہے۔ اس کے آس پاس کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ سلمیٰ نے بڑے پیار اور اپنائیت سے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو چلو اپنا نام ہی بتا دو۔"

وہ اپنا نام وحیدہ انجم بتانے جا رہی تھی۔ پھر "وحی.......... وحی.........." کہتے کہتے ایک دم سے چپ ہو گئی۔ اس کے تصور میں ہسپتال کے وہ پہلے دن کا منظر آیا۔ جب وہ اپنے محبوب کی نبض تھام کر پوچھ رہی تھی۔ "آپ کا نام؟"

اس نے بتایا تھا۔ "میرا نام نیکنام ہے؟"

سلمیٰ کی آواز سنتے ہی تصور مٹ گیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "تم چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا اپنا نام نہیں بتاؤ گی؟"

وحیدہ انجم نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر کہا۔ "میرا نام بدنام ہے۔" سلمیٰ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "میں صورت دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ تم کسی نہایت شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور شریف زادیوں کے نام ایسے نہیں ہوتے۔ اگر ایسے ہوتے تو پھر ان کے مرد بھی نیکنام نہیں ہوتے۔"

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ”یہی تو بات ہے کہ وہ نیک نام ہے۔ ازل سے ایسا ہوتا ہے۔ مرد نیکنام ہوتا ہے اور عورت بدنام ہوتی ہے۔“

”میں نام پوچھ رہی تھی۔ تم کردار کی باتیں کرنے لگیں۔ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میرے ہی شوہر کو لے لو۔ وہ بڑے سنجیدہ اور بڑے ریزرو رہنے والے آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو انہیں یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو بدنامی کی طرف لے جاتا۔“

وحیدہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”بہن! خوش نصیب ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اچھے مردوں کی اور اچھی عورتوں کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔“

”تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تمہیں اپنے میاں سے شکایت ہے اور ان سے کچھ اختلافات ہیں۔“

اختلافات کی بات آئی تو وحیدہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ کیا اچھا ہوتا کہ نیک نام شوہر کی حیثیت سے ہوتا۔ اس سے شکایتیں ہوتیں۔ بات بات پر اختلافات ہوتے۔ لڑتے جھگڑتے پھر صلح کرتے اس وقت وہ اپنے پاس بیٹھی ہوئی عورت سے کہہ سکتی تھی کہ ہاں جی' میاں بیوی میں تو اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے یہ باتیں سوچیں۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ سلمٰی نے کہا۔ ”تم بار بار ٹھنڈی آہیں بھرتی ہو۔ مجھے اپنا دکھ نہیں بتاؤ گی؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”سنا ہے کسی ہمدرد کو اپنا دکھ بتانے سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے مگر بوجھ بدستور رہتا ہے نا؟ دور تو نہیں ہوتا؟ پھر بتانے کا فائدہ؟“

سلمٰی نے پھر اس کی پشت کو محبت سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے دکھ کو دور کر دوں۔ تمہارے اتنے کام آؤں کہ تمہارا اپنا بھی کوئی اتنے قریب نہیں آیا ہو گا اور تمہاری تکلیف کو اپنایا نہیں ہو گا۔ تم ایک بار مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو۔“

وحیدہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سلمٰی کا چہرہ ایسا شفیق اور ایسا ممتا بھرا تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایسی عورت تھی جو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے تراشی جاتی ہے اور دوسروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہر دم بہہ جانے کے لئے تیار رہتی ہے۔ انہیں دیکھ کر' ان سے مل کر' ان کی باتیں سن کر بے اختیار ان پر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

وحیدہ نے کہا۔ ”اچھی بات ہے میں تم پر بھروسہ کروں گی۔ تمہیں اپنا دکھڑا سناؤں

گی لیکن ایک شرط ہے۔“

”بولو' میں تمہاری ہر شرط مان لوں گی۔“

وہ بولی۔ ”میں اپنا نام نہیں بتاؤں گی۔ اپنا نام بتاؤں گی تو میرے والدین کا نام بھی آئے گا۔ ہاں' اس کا نام بتا رہی ہوں۔ اس نے پہلی ملاقات میں مجھے اپنا نام نیک نام بتایا تھا۔ دوسری ملاقات میں اس کا دوسرا نام تھا۔ مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے۔ وہ جو کچھ اندر ہے وہ باہر نہیں ہے.......... میں اس کے باہر ہی رہوں گی اس کے اندر نہیں پہنچ سکوں گی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے مرد کا نام بھی نہیں جانتی ہو۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہ نام جانتی ہوں' نہ پتہ ٹھکانہ معلوم ہے۔“

”تعجب ہے۔ تم پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔ اتنا بڑا دھوکہ کیسے کھا گئیں؟ کسی کو اچھی طرح سمجھے بُوجھے بغیر' اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کئے بغیر اس حد تک اعتماد میں کیونکر کر لیا کہ اس کے بچے کی ماں بن گئیں؟“

”بے شک میں تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اتنی بڑی غلطی کیسے کی؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سوچتی ہوں اس کی پُروقار شخصیت سے متاثر کیسے ہو گئی تھی وہ جیسے کوئی جادوگر تھا۔ میں سحر زدہ ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی ٹھوکر کھانے کے بعد آخر میں جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ خواہ کتنی ہی تعلیم ہو جوانی کے ساتھ عقل کبھی نہیں ہوتی۔ ہوتی تو یہ میرے ساتھ نہ ہوتا۔“

”اب جو ہو گیا ہے۔ اس پر پچھتانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا ویسے اب کتنے مہینے ہو چکے ہیں؟“

”تین ماہ گزر چکے ہیں۔“

”تین ماہ تو بہت ہوتے ہیں۔ تم پہلے ہی اسے ضائع کر سکتی تھیں بدنامی سے بچ سکتی تھیں۔“

”ہاں کرنے کو تو بہت کچھ کر سکتی تھی لیکن اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب دوسرا مہینہ گزرنے لگا تو اس کا خط ملا کہ وہ ایک ماہ تک ہسپتال میں رہا ہے اور بہت بیمار ہے اس لئے آ نہیں سکتا۔ اب ہسپتال سے گھر جا چکا ہے کچھ دنوں میں آئے گا۔ میں پھر پُرامید ہو گئی۔ میں نے سوچا وہ آئے گا تو ساری بدنامی ڈھل جائے گی۔ ہم فوراً شادی کر لیں گے لیکن وہ دوسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ پھر میں اس کی تلاش میں نکلی۔ میں نے لاہور کے ہر

ہسپتال میں جا کر معلوم کیا کہ اس نے اپنے خط میں جس حادثے کا ذکر کیا تھا' اس حادثے والا کوئی مریض کسی ہسپتال میں ایک ماہ تک رہا تھا یا نہیں؟ پتہ چلا' ایسا کوئی مریض کسی ہسپتال میں نہیں تھا۔ تب اس کا جھوٹ اور بھی ثابت ہو گیا۔ وہ مجھے بہلا رہا تھا' دھوکہ دے رہا تھا۔ جب تین ماہ ہو گئے تو میں پریشان ہو گئی۔ اپنے والدین کے پاس آئی۔ وہ بہت عزت دار ہیں۔ ہمارا گھرانہ ایسا ہے کہ میری اس غلطی کو کسی نے معاف نہیں کیا۔ اس لئے میں لاہور واپس جا رہی ہوں۔ ایک بار پھر نیکنام کو تلاش کروں گی۔ نہیں ملے گا تو سوچ رہی ہوں کیا کروں؟ کہاں پناہ لوں؟ میں جہاں بھی جاؤں گی مجھ سے طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے۔ کسی میٹرنٹی ہوم میں بھی مجھے داخلہ نہیں ملے گا۔"

سلمیٰ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "خدا نے ہمیں خوب ملایا ہے میں تمہیں پناہ دوں گی اور تمہاری زچگی وغیرہ کا انتظام کروں گی لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ تمہیں تو شاید تمہارے ماں باپ قبول کر لیں مگر وہ بچہ.........؟"

"میں اسی کے لیے پریشان ہوں۔ دماغ میں کئی بار یہ بات آئی کہ اسے ختم ہو جانا چاہیے لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ اب اس کی عمر تین ماہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اسے قتل کرنا بہت بڑا جرم ہو گا۔ ایک گناہ تو میں نے کر ہی لیا۔ اس کے بعد اور گناہ کروں' یہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

سلمیٰ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسری برتھ پر گئی۔ پھر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر کے اندھیرے میں تکنے لگی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا مگر سوچ کی روشنی ہوتی ہے وحیدہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو وحیدہ نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ سلمیٰ پھر وہاں سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ آہستگی سے بولی۔ "اگر تم میری بات مانو تو تمہارے بچے کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ میں اسے گود لے لوں گی۔"

وحیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم' تم میرے بچے کو گود لو گی کیا تمہیں میرے بچے سے نفرت نہیں ہو گی؟"

سلمیٰ نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "کیا میں تم سے نفرت کر رہی ہوں۔ اس بے چارے بچے نے کیا قصور کیا ہے؟ وہ تو معصوم ہے میں اسے اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میں ماں نہیں بن سکتی۔"

وحیدہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس میں ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

تھی۔ وہ بولی۔ "تمہارے چہرے سے تو ماں کا نور ٹپکتا ہے تم ماں کیسے نہیں بن سکتیں؟ کیا بانجھ ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہ میں بانجھ ہوں اور نہ میرے شوہر ایسے تھے لیکن دو ماہ پہلے وہ کار چلا رہے تھے کہ ایک زبردست حادثہ ہو گیا۔ اسی حادثے میں ان کی جانگھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔"

سلمیٰ کہہ رہی تھی۔ "آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے میرے سسر کو بتایا کہ اب میرے شوہر کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔"

وحیدہ نے پوچھا۔ "تمہارے شوہر کہاں زیر علاج رہے تھے؟"

"ریلوے ہسپتال میں' میرے شوہر ریلوے میں انجینئر ہیں۔ میں انہیں کراچی ائرپورٹ سے رخصت کر کے آ رہی ہوں۔ وہ ریلوے کی طرف سے ٹریننگ کے لئے فرانس گئے ہیں۔ تقریباً ایک سال میں واپس آئیں گے۔ پھر یہاں آ کر چیف مکینیکل انجینئر بن جائیں گے اس کے بعد ہمیں سفر کرنے کے لئے سیلون کار ملے گی یا پھر ٹرین کے ساتھ ہمارے لئے سیلون کا خاص کمپارٹمنٹ لگایا جائے گا۔"

سلمیٰ کہہ رہی تھی' وحیدہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

"اگر میں اپنا بچہ دے دوں گی تو میری ایک کمزوری ہمیشہ اس عورت کے پاس رہے گی۔ اس کے ذریعے یہ میرے خاندان والوں تک پہنچے گی۔ کبھی زندگی کے کسی موڑ پر اس عورت سے اختلافات ہوئے تو یہ میری بدنامی کا باعث بن جائے گی۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "تمہارے دل میں اگر کسی قسم کا کوئی اندیشہ ہو تو مجھ سے صاف صاف باتیں کرو۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنی طرف سے صفائی پیش کروں۔ تمہارا دل جیت لوں اور تمہارے بچے کو اپنا لوں۔"

وہ پھر سوچنے لگے۔ "بچے سے تو نجات حاصل کرنی ہو گی۔ میں اس کو لے کر اپنے گھر واپس نہیں جا سکوں گی اور بچے کو اس عورت کے حوالے کر دوں گی تو یہی مناسب ہو گا کہ یہ میرا نام تک نہ جانے اور میرے گھر تک کبھی نہ پہنچے۔"

یہ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں اس کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتی ہوں؟ اس بچے کے ساتھ میں اپنے گھر واپس نہیں جا سکوں گی۔ مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیا وہی شرط کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہ پوچھوں؟"

"ہاں! میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میرے والدین کا پتہ ٹھکانہ بھی مجھ سے کبھی نہ

پوچھنا۔ میں ایک اجنبی کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی۔ زچگی کے بعد بچے کو تمہارے حوالے کر دوں گی۔ پھر تمہاری دنیا سے دور چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد ہم کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ملیں تو ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیں۔ بولو' میری یہ شرط منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے۔"

"کیا تمہارے سسرال والے اس بات کو مان لیں گے کہ ایک ناجائز بچے کو تم اپنی گود میں رکھو۔"

"سسرال میں صرف میرے سسر ہیں جو مجھے بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اور مجھے باپ کی محبت دیتے ہیں۔ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتے وہ خود چاہتے ہیں کہ میں کسی بچے سے بہلتی رہوں۔ مجھے تمہارا بچہ مل جائے گا تو میں اپنے شوہر کو یہاں سے یہ لکھ دوں گی کہ میں ان کے ہی بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ انہیں واپس آنے میں کم سے کم آٹھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ لگے گا۔ وہ واپس آنے کے بعد اس بچے کو اپنا ہی سمجھ کر خوب پیار کریں گے' اسے باپ کی محبت دیں گے۔ اس کے ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ دونوں بہت دیر تک مستقبل کے منصوبے بناتی رہیں اور ان منصوبوں پر اچھی طرح غور کرتی رہیں۔ پھر سلمیٰ نے کمپارٹمنٹ کی بتی بجھا دی۔ خود دوسرے برتھ پر جا کر لیٹ گئی۔ وحیدہ کو نیند نہیں آسکتی تھی۔ بہت سے مسئلے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ نیکنام دور ہو گیا تھا ماں باپ چھوٹ گئے تھے۔ ایک اجنبی خاتون اس کی زندگی میں آگئی تھی۔ اب اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس خاتون کے حوالے کرنا تھا۔ ایسی بہت سی سوچیں تھیں جو دماغ میں چبھ رہی تھیں۔ ویسے وحیدہ بہت ہی متاثر ہونے والا ذہن رکھتی تھی۔ کسی سے بھی فوراً ہی متاثر ہو جاتی تھی۔ نیکنام کے فریب میں بھی اسی طرح آگئی تھی اب دوسری بار وہ سلمیٰ کی شخصیت سے متاثر ہو رہی تھی۔

سلمیٰ اسے لاہور میں اپنے ہاں لے گئی تھی۔ اپنے سسر سے ملایا تھا پھر ایک الگ کمرے میں اپنے سسر کے ساتھ جا کر اس کی پوری روداد سنائی تھی۔ دوسرے دن بڑے میاں نے فیصلہ سنایا کہ سلمیٰ اور وحیدہ کو لاہور میں نہیں کراچی میں رہنا چاہئے۔ زچگی بھی وہیں ہو گی۔ بڑے میاں شہریار کے ملنے جلنے والوں کو اپنے دور کے رشتے داروں کو یہی کہیں گے کہ ان کی بہو خالہ زاد بہن کے ہاں زچگی کے لئے گئی ہوئی ہے۔ جب وہ کراچی

سے واپس آئے گی تو اس کی گود میں ایک بچہ ہو گا۔ اس طرح رشتہ داروں سے یہ بات چھپ جائے گی۔

کراچی بڑا بندہ پرور شہر ہے۔ یہاں ہر بندے کو روزی ملتی ہے بشرطیکہ وہ محنت کرنا جانتا ہو لیکن ہر بندے کو رفاقت نہیں ملتی یہ انسان سے زیادہ مشینوں کا شہر ہے اور جو انسان ہیں وہ بھی مشینوں کی طرح صبح سے شام تک چلتے رہتے ہیں' دوڑتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔ یہاں بیشتر گھرانے ایسے ہیں جو اپنے پڑوسیوں کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے۔ انہیں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ کسی سے مروت اور ملنساری کا رویہ اختیار کر سکیں۔ ایسے شہر میں جب سلمیٰ اور وحیدہ نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تو کوئی زیادہ کریدنے کے لئے نہیں آیا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ اور ان میں سے جو ایک عورت ہے وہ کس کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟

پہلی بار شہریار کے والد ان کے ساتھ آئے ان کے لئے رہائش کا انتظام کیا۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں مہیا کیں۔ پھر جاتے وقت اپنے گھر کی پرانی ملازمہ کو ان کے پاس چھوڑ گئے تاکہ وہ گھر کا اور باہر کا اوپری کام کرتی رہے۔ اس کے بعد بھی وہ مہینے' دو مہینے میں کراچی آجاتے تھے۔ ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ ان کی ضروریات کا تمام سامان مہیا کرتے تھے پھر چلے جاتے تھے۔ جب زچگی کا وقت قریب آنے لگا تو ہولی کراس کے میٹرنٹی ہوم میں وحیدہ انجم کو بیگم سلمیٰ شہریار کے نام سے داخل کرا دیا گیا تاکہ وہ بچہ شہریار کے نام سے منسوب ہو اور اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی اسی نام سے تیار ہو سکے۔

جیسے جیسے زچگی کا وقت قریب آتا تھا۔ وحیدہ کی حالت عجیب ہوتی جاتی تھی۔ اس کی سوچ بدلتی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر دل میں یہ بات پیدا ہوتی تھی کہ اتنی تکلیفیں اٹھا کر وہ بچے کو جنم دے گی اور کسی دوسرے کے حوالے کر دے گی۔ یہ زندگی کیسا مذاق کر رہی تھی' ایک تو جوانی غارت ہوئی محبت کا فریب ملا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اب ماں بن رہی تھی تو اس سے ممتا کے حقوق چھینے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ جھنجلا کر سوچتی تھی کہ اپنا بچہ کسی کو نہیں دے گی۔ اپنے کلیجے سے لگا کر رکھے گی۔

ہونے والی اولاد نے اسے بڑا پریشان کیا۔ وہ رہ رہ کر دردِ زہ میں مبتلا ہوتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر اسے آکر دیکھتی تھی اور پیش گوئی کرتی تھی کہ شام تک زچگی ہو جائے گی۔ مگر شام سے صبح ہو جاتی تھی اور کچھ نہیں ہوتا تھا بچہ تھا کہ دنیا میں آنے کا نام نہیں لیتا تھا اور وہ دن رات ایسی اذیتیں برداشت کر رہی تھی کہ ان اذیتوں کو مائیں ہی سمجھ سکتی ہیں اور

ایسی تکالیف اٹھانے کے بعد اس کے خیالات کیوں نہ بدلتے۔ اس کی ماماتا کیوں نہ اسے جھنجوڑتی۔ وہ درد و کرب کے دوران اپنے ہوش میں نہیں رہتی تھی لیکن جب درد میں کمی ہوتی تب یہی سوچتی کہ اتنی تکلیفوں سے پیدا ہونے والے بچے کو وہ نہیں چھوڑے گی۔

ایک شام لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین سے کہا کہ گھنٹے دو گھنٹے کے اندر زچگی ہو جائے گی۔ اسے زچہ خانے پہنچایا گیا۔ مگر وہی درد و کرب کا دور تھا کہ ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ دو گھنٹے سے چار اور چار سے آٹھ گھنٹے ہو گئے۔ ساری رات مصیبتوں میں کٹی۔ ادھر سلمٰی پریشان ہو کر زچہ خانے سے باہر ساری رات ٹہلتی رہی۔ اس کے سسر بھی آ گئے تھے۔ آپا بھی بے چاری دعاؤں میں لگی ہوئی تھی۔ ادھر وحیدہ اپنی زندگی کے لیے موت سے لڑ رہی تھی۔

وہ رات بھی کٹ گئی تھی مگر ایک ماں کی مصیبت نہ کٹی۔ صبح آٹھ بجے لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ میجر آپریشن کی ضرورت ہے۔ شہریار کے والد کو ہسپتال کے اس معاہدے پر دستخط کرنا پڑے کہ آپریشن ناکام ہوا تو اس کی ذمہ داری ڈاکٹروں پر نہ ہو گی۔ انہوں نے ایک بزرگ سرپرست کی حیثیت سے دستخط کر دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ سلمٰی اور بے چاری آپا تینوں ہسپتال کے برآمدے میں بے چینی سے وقت گزارتے رہے۔ دوپہر کے قریب انہیں یہ خوش خبری ملی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں بلکہ بچے خیریت سے ہیں کیونکہ جڑواں ہوئے ہیں اور اب ان کے آپریشن کا مرحلہ باقی ہے۔

وحیدہ کو ہوش آیا تو اس نے اپنے قریب سلمٰی کو موجود پایا۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم بستر پر پڑی رہی۔ اسے یاد آیا کہ وہ زچگی کے مرحلے سے گزرنے والی تھی اور اب کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے' پھر اسے یاد آیا کہ اسے آپریشن کے لئے لے جایا گیا تھا۔ سلمٰی نے اسے سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "بہن ساری مصیبتیں دور ہو چکی ہیں۔ میں تمہیں خوشخبری سناؤں کہ تم ماں بن چکی ہو بلکہ ...."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وحیدہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کے لئے کہا۔ پھر بولی۔ "میں کتنی مصیبتوں سے گزر کر ماں بنی ہوں یہ تم نے دیکھا ہے۔ تم ایک عورت ہو' خود ہی فیصلہ کرو۔ کیا میں بچے کو تمہارے حوالے کر دوں۔ کیا میری ماماتا کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں؟ ایک فریبی نے مجھے پہلے ہی ختم کر دیا ہے مجھ میں

جو باقی بچا ہے وہ صرف ممتا ہے۔ میں اپنے بچے کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتی' اگر کروں گی تو مر جاؤں گی۔"

سلمٰی نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہاری ممتا کو سمجھتی ہوں۔ بے شک تمہیں بچے کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہئے۔ بچے کو تمہاری ضرورت ہے اور مجھے بھی بچے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ میں تمہیں یہی خوش خبری سنانے جا رہی تھی کہ تم نے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ وہ جڑواں بچے ہیں اور ڈاکٹر انہیں آپریشن کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ کرنے لے گئے ہیں۔"

وحیدہ نے حیرانی سے یہ بات سنی۔ پھر چپ ہو کر اپنے تصور میں ان دو بچوں کو دیکھنے لگی۔ سلمٰی نے کہا۔ "دیکھو بہن! اب انکار نہ کرنا۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ اب تمہاری ممتا کے ارمان بھی پورے ہوں گے اور میری خالی گود بھی بھر جائے گی۔ ایک بچہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ ایک میں رکھ لوں گی۔"

وحیدہ نے پوچھا۔ "بچے کہاں ہیں؟"

"وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگرانی میں ہیں۔ ہم کل صبح تک انہیں دیکھ سکیں گے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر سلمٰی کے ہاتھ کو تھام لیا۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب جبکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے احسان کا بدلہ چکانے کی توفیق عطا کی ہے تو ایک بچہ میں تمہیں ضرور دوں گی مگر شرط وہی ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے تم کبھی میرے یا میرے خاندان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

سلمٰی نے کہا۔ "پگلی ہوئی ہو۔ جب میں نے اب تک کچھ نہیں پوچھا تو آئندہ کیوں پوچھوں گی؟"

شہریار کے والد نے جب یہ سنا تو انہوں نے وحیدہ کو سمجھایا۔ "بیٹی! یہ بچہ تمہارے ساتھ رہے گا تو تم بدنامی اٹھاتی پھرو گی۔ کہاں جاؤ گی؟ کیا تمہارے والدین تمہیں قبول کریں گے؟"

اس نے سر جھکا کر کہا۔ "میں اب خانپور نہیں جاؤں گی۔ اپنے خاندان والوں کو اس وقت تک منہ نہیں دکھاؤں گی۔ جب تک بچے کے باپ کو تلاش نہیں کر لوں گی۔ کبھی کبھی میرا دل کہتا ہے کہ وہ فریبی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مصیبت پیش آئی ہے

اس کے ساتھ کوئی مجبوری ہے۔ جب وہ اپنی مصیبتوں سے نکلے گا' اپنی مجبوریوں کے پار ہو گا تو مجھے تلاش کرے گا میرے پاس ضرور آئے گا۔ مجھے یہ سوچنا چاہیے کہ خدانخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ وہ مجبور ہو سکتا ہے۔"

شہریار کے والد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بیٹی! ایسا بھی سوچا جا سکتا ہے۔ خدا کرے کہ وہ بے وفا نہ ہو۔ ایک شریف انسان ہو' اور شرافت سے آکر تمہارا ہاتھ تھام لے' اس بچے کو اپنا نام دے' میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر ہسپتال سے جانے کے بعد تم تنہا کہاں رہو گی۔ میں تو اپنی بہو اور بچے کو لاہور لے جاؤں گا۔"

وحیدہ نے کہا۔ "جناب آپ لوگوں نے اتنا ساتھ دیا ہے' ایک آدھ ہفتہ اور میرے ساتھ رہ جائیں۔ میں اپنی والدہ سے رابطہ قائم کروں گی اور اپنے مستقبل کے متعلق ضروری فیصلے کروں گی۔"

دوسری صبح دو نرسیں دو بچوں کو لے کر آئیں۔ ایک بچے کو وحیدہ نے گود میں لے لیا۔ دوسرے کو سلمٰی نے سینے سے لگایا۔ وہ انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہیں۔ وحیدہ نے کہا۔ "ہم انہیں الگ الگ کیسے پہچانیں گے یہ تو بالکل ایک جیسے ہیں۔"

ایک نرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "صورت' شکل' قد و قامت اور صحت سب کچھ ایک جیسی ہے۔ بس ایک ہی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایک بچے کے دائیں بازو پر یہ زخم کا نشان ہے اور دوسرے بچے کے بائیں بازو پر اسی طرح سے جڑے ہوئے تھے اور یہیں سے آپریشن کے ذریعے انہیں الگ کیا گیا ہے۔"

نرسوں کے جانے کے بعد شہریار کے والد نے کہا۔ "میں اپنے پوتے کا نام امیر شہریار رکھوں گا۔ کیوں بہو! کیسا نام ہے؟"

سلمٰی نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت اچھا ہے نام۔ امیر۔"

وحیدہ نے کہا۔ "میں اپنے بیٹے کا نام کبیر رکھوں گی۔ ایک امیر دوسرا کبیر......... دونوں بھائی امیر' کبیر ہوں گے۔"

ایسا کہتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو کر سوچنے لگی' پھر بولی۔ "مگر دونوں بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکیں گے۔ ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ کبھی نہیں معلوم ہو گا کہ امیر اور کبیر کے درمیان خون کا رشتہ ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ سلمٰی اس کا ہاتھ تھام کر اسے تھپکنے لگی۔

اسے تسلیاں دینے لگی۔ اسی دن وحیدہ نے ہسپتال سے اپنے والد کو ٹرنک کال کے ذریعے مخاطب کیا۔ انہیں بتایا کہ وہ کراچی میں ہے اور اپنی امی کو دو چار روز کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے۔

اس کے والد ٹیلی فون پر چند لمحوں تک خاموش رہے۔ اس نے پوچھا۔ "ابا جان! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا میری آواز آپ تک نہیں پہنچ رہی ہے یا آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟"

"نہیں بیٹی! تم سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گا۔ تم ہی تو ہماری آرزوؤں اور خوشیوں کا مرکز ہو۔ تم سے ناراض ہو تو سکتے ہیں لیکن تمہیں نہ تو بھلا سکتے ہیں اور نہ ہی تمہیں اپنے دل سے نوچ کر پھینک سکتے ہیں تم کیسی ہو بیٹی؟"

اس کے ابو خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہ نادان نہیں تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ بچے کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر شرم سے کچھ بول نہیں سکتے۔ وہ آہستگی سے بولی۔ "ابو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"کیسے نہ کروں میں راتوں کو سوتا نہیں ہوں۔ سوتا بھی ہوں تو صبح اٹھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نیند میں جاگتا رہا ہوں' تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں' بیٹی! تم والدین کی محبت کو نہیں سمجھ سکو گی۔"

"پہلے شاید نہیں سمجھتی تھی۔ اب قدرت نے سمجھا دیا ہے۔ اب میں سمجھ رہی ہوں کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ وہ ہوتی ہے کہ اس کے لئے دنیا جہاں کی بدنامیوں سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

آخر اس نے باتوں ہی باتوں میں کہہ دیا۔ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟ ایسے خیالات نہ رکھو۔ ممتا کو اتنا شدید نہ ہونے دو۔ تمہیں یہاں اکیلے واپس آنا ہے۔"

"نہیں! اب میں واپس نہیں آؤں گی۔ یہاں کراچی میں رہنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے پلاٹ پر اپنے وعدے کے مطابق ہسپتال تعمیر کرا دیں۔ میری رہائش کا بندوبست کریں۔ میں یہاں تنہا رہوں گی۔ آپ لوگ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آجایا کریں......... بس۔"

"یہ بات کتنی سنگدلی سے کہہ رہی ہو۔ کیا ہم کبھی کبھی تمہاری صورت دیکھیں؟ ابھی تمہیں دلہن نہیں بنایا' تمہیں رخصت نہیں کیا کہ صبر آجاتا کہ بیٹی پرائی تھی' پرائی ہو

گئی۔ تم تو ابھی پرائی نہیں ہو بیٹی! ہم کس دل سے تمہیں دور کریں؟"

"ابو' سیدھی سی بات ہے۔ آپ اپنے دل سے مجھے نکال کر نہیں پھینک سکتے؟ کوئی اپنی اولاد سے ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی محبت کی کسوٹی پر میری محبت کو پرکھنے کی کوشش کریں اور انصاف سے وہی کریں جو میں چاہتی ہوں۔ آپ امی کے ساتھ یہاں آسکتے ہیں۔ میں ایڈریس دے رہی ہوں۔ اس ایڈریس پر آپ ٹیلی گرام دے دیجئے کہ کس ٹرین سے کس دن کس وقت یہاں پہنچ رہے ہیں میں اس وقت اسٹیشن پر آکر ملوں گی۔"

اس نے اپنا موجود ایڈریس نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ "ایک بات یاد رکھئے کہ آپ لوگ اس پتے پر اچانک نہ پہنچیں۔ کیونکہ میں جس فیملی کے ساتھ ابھی رہتی ہوں۔ انہیں نہ تو اپنا نام بتایا ہے اور نہ ہی آپ لوگوں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ میں ان کے لئے ایک اجنبی ہوں اور اجنبی کی حیثیت سے رخصت ہو جاؤں گی۔ اس سے پہلے آپ لوگوں سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ میری مستقل رہائش کا انتظام کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

"بیٹے! میں ضرور کروں گا۔ جو تم چاہو گی' وہی کروں گا' مجھے تمہارا تحفظ اور تمہاری سلامتی منظور ہے۔ تمہیں جلد ہی ہماری طرف سے ٹیلی گرام ملے گا۔"

دوسرے دن ٹیلی گرام موصول ہوا کہ اس کی والدہ.......... ماہ رواں کی سات تاریخ کو عوامی ایکسپریس سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ سلمٰی نے وہ ٹیلی گرام موصول کیا تھا۔ وحیدہ نے اسے بتایا کہ اس کے والدین پہنچنے والے ہیں لیکن وہ تنہا اسٹیشن جائے گی اور ان سے ملاقات کرے گی۔

سلمٰی نے کہا۔ "بے شک ہم تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ میں نے زبان دی ہے ہم تمہارے یا تمہارے والدین کے متعلق نہ کوئی سوال کریں گے اور نہ ہی چوری چھپے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے بس ہماری دعا ہے کہ تمہارے والدین تمہیں بچے کے ساتھ قبول کرلیں۔"

چند دن کے بعد ماں بیٹی ریلوے پلیٹ فارم پر ملیں۔ ماں کے آنسو نہ رک سکے۔ وہ نقاب کے پیچھے روتے روتے بولیں۔ "بیٹی! وہ کہاں ہے؟"

وحیدہ فوراً ہی نہ سمجھ سکی۔ اس نے پوچھا۔ "وہ؟ آپ کسے پوچھ رہی ہیں؟" پھر وہ فوراً ہی سمجھ کر بولی۔ "میرا منا! میں اسے اپنی محسنہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔"

وہ دونوں پلیٹ فارم سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھیں۔ اس کی والدہ نے سوسائٹی کے ایک علاقہ کا پتہ بتایا پھر ٹیکسی چل پڑی۔ وحیدہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "میں جانتی ہوں ابو نہیں آئیں گے۔"

وہ بڑی محبت سے سمجھانے کے انداز میں بولیں۔ "تم یہاں تنہا رہو گی تو وہ تم سے دس بار ملنے آئیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ خانپور بھی لے جائیں گے اور بچے کے ساتھ رہو گی تو وہ کبھی تمہارا سامنا نہیں کریں گے وہ' اس' بچے کی موجودگی میں .... میں کیا بتاؤں کہ کیسی شرم محسوس کریں گے۔ تم اگر شرافت کو ذرا بھی سمجھ سکتی ہو تو ان کی شرم کو بھی سمجھ لو گی ...."

وحیدہ نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھائی۔ اسے خیال آگیا کہ سامنے بیٹھا ہوا ٹیکسی ڈرائیور ان کی باتیں سن سکتا ہے' سمجھ سکتا ہے اس نے پوچھا۔ "امی! کیا آپ اس پلاٹ پر پہلے بھی آچکی ہیں؟"

"ہاں! میں دو بار تمہارے ابو کے ساتھ یہاں آچکی ہوں۔ یہ چار ہزار گز کا پلاٹ ہے۔ اس پر دو کمرے کا ایک چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہے۔ ہسپتال کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ صرف تمہارے امتحان پاس کر کے آنے کی دیر تھی۔ پھر تمہارے سامنے تعمیر کام شروع ہوتا۔ اب تمہارے ابو نے کہا ہے کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو گی۔ وہ یہاں تمہارے بنک اکاؤنٹ میں بھیج دیں گے۔ تم یہاں اپنا اکاؤنٹ کھول لو۔ اس کے بعد اپنی موجودگی میں اپنی مرضی کے مطابق ہسپتال تعمیر کرا لینا۔ تمہیں کسی چیز کی یہاں پر کمی نہیں ہو گی۔"

کچھ وقت اور گزرا۔ ایک چھ بستروں کا چھوٹا سا ہسپتال تعمیر ہو گیا تھا۔ وہ اسے کلینک کہتی تھی۔ اس چھوٹے ہسپتال کی پیشانی پر بڑا سا بورڈ لکھ کر لگایا تھا۔ "نیکنام کلینک۔ ڈاکٹر وحیدہ انجم!" وہ اس نام کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ جس نے اسے بدنام کیا تھا اور محبت کا روگ لگایا تھا۔ یہ روگ ہی ہے کہ اتنے صدمات سہنے اور بدنامیاں اٹھانے کے بعد بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچتی تھی' ضرور وہ مصیبتوں میں گرفتار ہے۔ حالات اس کے دشمن ہیں۔ اسے آنے نہیں دیتے' جب بھی آنے کا موقع ملا تو وہ ضرور آئے گا۔ اسے تلاش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کلینک کا نام پڑھ کر یہاں آجائے۔ وہ اکثر بارہ بجے زوال کے وقت آیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ مریضوں کے جانے کے بعد بھی بارہ بجے سے ایک بجے تک کلینک کے چیمبر میں تنہا بیٹھی رہتی تھی۔

ماضی ایسا ہوتا ہے کہ اسے یاد کرتے کرتے عمر گزر جاتی ہے وحیدہ انجم کو پتہ بھی نہ

چلا کہ ان یادوں میں بہتے بہتے تین بجنے لگے تھے۔ اچانک ہی اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کی بوڑھی ملازمہ اسے آوازیں دیتے ہوئے' دوڑتے ہوئے چیمبر میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "بی بی جی! غضب ہو گیا۔ کبیر بابا کا پتہ نہیں ہے۔ ہم نے اس کو تمام کمروں میں دیکھا' گارڈن میں دیکھا مگر وہ نہیں ہے۔ پھر ہم کوٹھی کے باہر مین گیٹ کے پاس گیا تو باہر سڑک پر کنارے بابا کا کھلونا پڑا ہوا تھا۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ "میرا بچہ! میرا بیٹا! میرا کبیر!"

☆======☆======☆

ٹرالی لوہے کی پٹڑی پر دوڑتی جا رہی تھی۔ شہریار چھتری کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا دو جونیئر آفیسر بھی اس سے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے سلمیٰ کو حکم دیا تھا کہ وہ دونوں بچوں کو لے کر سیلون کار سے باہر چلی جائے۔ اس کے لئے یہ سزا کافی تھی۔ مگر سزا دینے کے باوجود وہ اندر سے اضطراب میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ سلمیٰ چار برس تک اس سے یہ بات چھپاتی رہی' اسے دھوکہ دیتی رہی۔ اگر اس کی بھلائی کے لئے ایسا کیا تھا تب بھی اس کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ کیونکہ وہ ناجائز بچے کو اس کی گود میں کھلاتی رہی تھی۔

پھر یہ خیال آتا کہ کیا ایکسیڈنٹ کے بعد واقعی ڈاکٹر نے یہ رپورٹ دی تھی کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ اس بات کی تصدیق ہونی چاہئے اگر تصدیق ہو گئی تب بھی اس عورت کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ جس نے اتنا بڑا ڈرامہ کھیلا جڑواں بچوں کو اس سے چھپایا۔ ایک بچے کو اس کے سامنے لائی۔ دوسرے کو کسی عورت کے پاس چھوڑا۔ اب ان بچوں کی ماں سلمیٰ ہے یا کوئی دوسری عورت ہے۔ اس بات کا یقین کیسے کیا جائے؟ کیا سلمیٰ نہیں ہو سکتی؟

وہ بے چینی سے اپنی سیٹ پر پہلو بدلنے لگا۔ اس کے اندر سے آواز آرہی تھی۔ سلمیٰ ایسی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس میں ذرا بھی سستا پن نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرم ہے۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی ہے۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کے دوستوں سے مسکرا کر بات نہیں کی۔ دوست کبھی گھر آتے تو وہ ان کے سامنے چائے اور ناشتہ پیش کرنے کی حد تک آتی تھی۔ پھر کام کے بہانے چلی جاتی تھی۔ شہریار

جانتا تھا کہ پچھلے چھ برسوں میں اس نے سلمیٰ کی ایسی کوئی غلطی نہیں پکڑی جس سے اس کے شبہ کو تقویت پہنچتی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اندر سے کچھ ہوتا ہے اور باہر سے کچھ ہوتا ہے۔ عورت ظاہراً تو اپنے آپ کو بڑی وفادار بڑی پارسا بنا کر پیش کرتی ہے لیکن اندر ہی اندر کیا گل کھلاتی ہے؟ یہ بعد میں پتہ چلتا ہے اور بہت سے بدنصیب مرد ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

یہ شہریار کا ذاتی تجربہ تھا۔ وہ خود دوہرے کردار کا مالک تھا گھر میں مردوں کی طرح بیوی کے سامنے نہایت سنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو گھر کے کسی سامان کو توڑ پھوڑ کر غصے کا اظہار کرتا تھا۔ ملازموں کو جھڑکتا تھا اور سلمیٰ کو ہر دم سہمے رہنے اور محتاط رہنے پر مجبور کرتا رہتا تھا۔ گھر کے باہر جب دورے پر نکلتا تو پرائی عورتوں کے سامنے سنجیدگی شوخی میں بدل جاتی تھی۔ افسرانہ رعب اور دبدبہ بھی خاک ہو جاتا تھا۔ کیونکہ پرائی عورتوں پر رعب جمانے اور غصہ کرنے سے وہ ٹھینگا دکھا کر چلی جاتی ہیں۔ محبت اور رومانس کا ماحول ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ کالج کا شریر طالب علم بن جاتا تھا۔

☆======☆======☆

ٹرالی رک گئی۔ خیالات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس نے ٹرالی سے اترتے ہوئے آس پاس کے ماحول کو دیکھا۔ وہ ملیر برج کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت اس کا موڈ کچھ اور تھا۔ وہ کسی کام کی طرف توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے وہ شرمیلی لیڈی ڈاکٹر یاد آرہی تھی جسے پا کر اس نے کھو دیا تھا اور کھو دینے کے بعد کئی بار پانے کی تمنا کی تھی۔ صرف تمنا کی تھی کوشش نہیں کی تھی۔

پُل کی مرمت کرنے والا ٹھیکیدار خوشامدانہ انداز میں سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ شہریار نے اسسٹنٹ انجینئر سے کہا۔ "میں آرام کرنا چاہتا ہوں کیا تم کام سنبھال لو گے؟"

"یس سر! آپ بیشک آرام کریں اور بے فکر رہیں۔ میں سارا کام سنبھال لوں گا۔"

ٹھیکیدار نے کہا۔ "جناب! دھوپ بہت تیز ہے۔ ٹرالی میں آنے جانے سے لُو لگ جائے گی۔ اگر واپس جانے کا ارادہ ہو تو میری ائرکنڈیشنڈ کار حاضر ہے۔"

پندرہ منٹ بعد وہ ایک آرام دہ گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کام کی بات چھیڑنا چاہی۔ شہریار نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز! میں کام کی کوئی

بات سننا نہیں چاہتا ہوں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔"

پھر تمام راستے خاموشی رہی۔ گاڑی چلتی رہی اور وہ خیالات کی رو میں بہتا رہا۔ ٹھیک زوال کے وقت وہ لیڈی ڈاکٹر وحیدہ انجم کے سامنے پہنچ گیا۔ دراصل وہ اپنے ایک دوست کی عیادت کے لئے آیا تھا واپس جاتے وقت اس نے ہسپتال کے ایک کمرے میں دیکھا تو وحیدہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ایسی پیاری پیاری سی لڑکی تھی' ایسی من موہنی صورت تھی کہ من کو موہ رہی تھی۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اس لڑکی کو حاصل نہ کیا تو زندگی میں کچھ نہ کیا۔

ایک ہوس ہوتی ہے۔ اس کو چھونے کے بعد اس کو چھوڑنے کی تمنا ہوتی ہے۔ گھر سے نمکین کھا کر نکلنے کے بعد باہر میٹھی ڈش کھانے کو جی چاہتا ہے۔ بہت کم لوگ اصول پسند ہوتے ہیں گھر سے کھا پی کر نکلتے ہیں تو باہر ایک پیالی چائے تک نہیں پیتے۔ مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اس نے جب وحیدہ کو دیکھا تو دل نے مچل کر کہا۔ "میرے پاس سب کچھ ہے۔ بس یہ ایک حسینہ نہیں ہے جو نبض تھام کر درد کی دوا کرتی ہے۔" لہٰذا وہ اسی وقت بیمار بن کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اپنی کلائی بڑھا دی۔ اس نے نبض کو تھام کر پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

اس نے اپنا نام بے اختیار نیکنام بتایا تھا اور اپنی اس شوخی پر اندر سے جھوم گیا تھا۔ واہ کیا مزے کا نام بتایا ہے۔ اگر یہ بات گھر کی عورت کو معلوم ہوتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتی کہ اس کا میاں باہر اتنا شوخ اور چنچل ہو جاتا ہے۔

دوسری' تیسری ملاقاتوں میں شہریار کو اپنے دل کا حال معلوم ہوا کہ وہ خود کو وحیدہ سے بہلا نہیں رہا ہے بلکہ سچ مچ اسے دل سے لگا رہا ہے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی کہ دل سے لگ جاتی تھی۔ مزید چند ملاقاتوں میں وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا ضمیر اندر سے ملامت کرتا تھا کہ اتنی حسین تعلیم یافتہ اور شریف لڑکی کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ اس کی محبت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ اب سلمٰی کے سامنے بھی وحیدہ کی ہی صورت دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کرے؟ کس طرح وحیدہ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لئے لے آئے۔

وہ وحیدہ کے ساتھ باہر کے لئے نکلتا تو محتاط ہو کر آس پاس دیکھتا رہتا۔ کہیں کوئی جان پہچان والا نہ دیکھ لے۔ وحیدہ کے سامنے اس کی افسری اور اس کے خاندان والوں کا بھید نہ کھل جائے۔ اس بے چاری نے اپنے والدین کا نام اور پتہ سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ

خود کو چھپاتا جا رہا تھا' اس کی معصومیت سے کھیلتا جا رہا تھا۔

وحیدہ دل میں سماتی رہی۔ اب اس کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ محبوبہ وہ ہوتی ہے جو حاصل ہوتے ہوئے بھی دور کی چیز ہوتی ہے۔ جو انتظار کراتی ہے۔ راتوں کو جگاتی ہو' دن کو دوڑاتی ہو۔ اگر وحیدہ کی جگہ سلمٰی ہوتی اور سلمٰی کی جگہ وحیدہ بیوی ہوتی تو شہریار سلمٰی کے لیے تڑپتا۔ بات محض پوزیشن کی تھی۔ پوزیشن بدلنے سے محبت اور وفا کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔

ایک دن وحیدہ نے کہا تھا۔ "ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ تم میرے ساتھ خانپور چلو۔ میں اپنے والدین سے تعارف کراؤں گی۔ پھر وہاں ہماری شادی ہو جائے گی۔"

اس نے بات بنائی۔ "میں کس منہ سے تمہارے والدین کے سامنے جاؤں۔ میں بے روزگار ہوں جب تک کوئی اچھی ملازمت نہ ملے۔ اس وقت تک شادی کرنا حماقت ہے۔"

"نوکری ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گی۔ روزگار کی فکر نہ کرو۔ میں ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ لاکھوں میں کھیلتی ہوں۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔"

"نہیں وحیدہ! ایسا نہ کہو۔ میں شادی کے بعد سسرال کے پیسے پر......... گزارہ نہیں کروں گا۔ یہ میری توہین ہے۔"

اس نے بڑی خوبصورتی سے باتیں بنائیں لیکن تنہائی میں سنجیدگی سے وحیدہ کو اپنانے کے مسئلے میں الجھا رہتا تھا۔ مذہب میں دوسری شادی کی اجازت ہے لیکن اس کے لئے جواز پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر پہلی بیوی اچھی ہو' صحت مند ہو' ازدواجی زندگی اچھی طرح گزار رہی ہو' کسی بات کی کمی نہ ہو تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ پہلی بیوی سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

اس نے کئی بار سوچا کہ سلمٰی میں کس طرح کوئی عیب نکالے؟ کوئی کمزوری ڈھونڈے' اس میں کوئی ایسی کمی ثابت کر دے کہ دوسری شادی کی اجازت مل جائے۔ لے دے کر ایک اولاد نہیں ہوئی تھی شادی کو صرف دو برس ہوئے تھے۔ کوئی ضروری تو نہیں۔ چار برس اور چھ برس بعد بھی اولاد ہوتی ہے۔ پھر بھی اس نے سوچا۔ شاید سلمٰی بانجھ ہو۔ اگر بانجھ ہونے کی ڈاکٹری رپورٹ مل جائے تو وہ خوب دھوم دھڑاکے سے وحیدہ کو اپنی دلہن بنا کر لا سکتا ہے۔

ٹھیکیدار نے کینٹ اسٹیشن کے پاس گاڑی کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "جناب! اور کہیں

جانا ہو تو حکم دیجئے؟"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ اس نے ونڈ اسکرین کے پار کینٹ اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا۔ پھر گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "بس اور کہیں نہیں جانا' شکریہ۔"

"جناب! حکم ہو تو شام کو حاضر ہو جاؤں؟ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں آج کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔ کل سیلون کار میں آکر مجھ سے ملاقات کرنا۔"

وہ وہاں سے چلتا ہوا اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ اسے اسٹیشن ماسٹر سے بھی ملاقات کرنی تھی لیکن دل یہی چاہتا تھا کہ تنہائی ہو اور وحیدہ کی یادیں ہوں۔ سلمیٰ کی بے وفائی کے بعد وحیدہ کچھ اور شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچا اور وہاں سے گزرتے ہوئے اپنی سیلون کار کی طرف چلنے لگا تو پولیس انسپکٹر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "آپ کی وائف یہاں رپورٹ درج کرانے آئی تھیں۔ بچے کی تصویر بھی دی ہے۔ مین نے تمام تھانوں میں اس رپورٹ کے مطابق خبر پہنچا دی ہے۔ اس بچے کا کوئی دعوے دار ہو گا تو اسے یہاں بھیج دیا جائے گا۔"

شہریار نے پوچھا۔ "میری وائف نے بچوں کو حاصل کرنے کے لیے کہاں کا پتہ لکھوایا ہے؟"

"وہ اپنی کسی بہن کا پتہ لکھوانا چاہتی تھیں لیکن ان کو مکان کا نمبر یاد نہیں رہا۔ اس لئے یہاں کا پتہ لکھوا دیا ہے کہ کینٹ اسٹیشن کی ایک ڈیڈ لائن پر سیلون کار کھڑی ہوئی ہے۔ وہیں بچہ مل سکتا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا میری وائف اور وہ بچے سیلون کار میں ہیں؟"

"پتہ نہیں جناب! آدھ گھنٹے پہلے میں نے انہیں بچوں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ ایک آیا بھی تھی۔"

شہریار نے اطمینان کی سانس لی۔ سلمیٰ کی یہی بات اچھی لگتی تھی۔ اسے جو حکم دیا جاتا اس پر خاموشی سے عمل کرتی تھی۔ ایک ہی بار کہنے پر وہ بچوں کو لے کر چلی گئی۔ ایسی عورتوں میں کمزوریاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ قدرت بھی ان پر مہربان ہوتی ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ نے بتایا کہ سلمیٰ بانجھ نہیں ہے۔ وہ ماں بن سکتی ہے۔ شہریار کا یہ حربہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ دوسری شادی کرنے کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا تھا۔

کئی بار اس نے سوچا کہ وحیدہ انجم کو اپنی مصیبت بتا دے۔ جب اس کے شادی

شدہ ہونے کی بات معلوم ہو گی تو وہ روئے گی۔ فریاد کرے گی۔ پھر اس کی دنیا سے دور چلی جائے گی۔ یا محبت نے زیادہ جوش مارا تو اس حالت میں بھی اس کی محبت قبول کرتی رہے گی۔ ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی شدہ مردوں کا بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ شاید وحیدہ انجم بھی ایسی ہی ہو۔

لیکن جب وہ ملاقات کے دوران اس سے باتیں کرتا تھا اور اس کی باتیں سنتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اسے جب معلوم ہو گا کہ میں شادی شدہ ہوں تو یہ جاہل عورت کی طرح دامن پکڑ کر فریاد نہیں کرے گی۔ بلکہ گریبان پکڑ کر محاسبہ کرے گی۔ پڑھی لکھی' تیز طرار لڑکیوں میں یہی خامی ہے کہ جب خود ڈوبتی ہیں تو ساتھ لے کر ڈوبتی ہیں۔ بدنام ہوتی ہیں تو بیچ بازار میں اپنے عاشق کی عزت بھی اتار دیتی ہیں۔

اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ وہ یہی بہتر سمجھتا رہا کہ وحیدہ سے جیسے عشق چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے گا۔ جب خطرے کی گھنٹی بجے گی تو اس کی زندگی سے غائب ہو جائے گا۔ پھر ایسا ہی وقت آگیا۔ ایک بار وہ اس سے رخصت ہو کر اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا مال روڈ سے گزر رہا تھا کہ اچانک اسٹیئرنگ بہک گیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔

اس کے خیالات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا۔ وہ چلتے چلتے اپنی سیلون کار کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اردلی اٹینشن کھڑا ہوا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھتا ہوا اندر آیا۔ پھر اندرونی دروازے کو کھول کر سیلون کار کے خصوصی کمرے میں پہنچا وہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ سلمیٰ جب بھی گھر چھوڑ کر جاتی تو گھر کی ایک ایک چیز کو اپنی جگہ اسی طرح رکھنے اور صفائی کرنے کے بعد جاتی تھی۔ ایک خط میں اس کی رہنمائی کی جاتی تھی کہ سلمیٰ کی غیر موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے؟ اس نے نظریں دوڑائیں ایک برتھ کے ایک سرے پر ایک تکیہ رکھا ہوا تھا اور تکیئے کے اوپر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ ایک پیپر ویٹ سے دبا ہوا تھا۔ اس نے پہلے تو سوچا کہ اسے ہاتھ نہ لگائے۔ پھر اس خیال سے اسے اٹھا لیا کہ سلمیٰ نے اپنی بہن کے ہاں رہنے یا پھر سیلون کار میں واپس آنے کے سلسلے میں کچھ لکھا ہو گا۔

اس نے تہہ کئے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ لکھا ہوا تھا۔

"میں آپ کے حکم کے مطابق جا رہی ہوں۔ رات کو آٹھ بجے تک اپنی بہن کے ہاں انتظار کروں گی۔ آپ کو ضرور آنا ہو گا۔ ورنہ میرے میکے میں میری سبکی ہو گی۔ اگر

آپ نہ آئے تو میں آپ کی مصروفیات کا بہانہ کرکے اپنی بہن سے رخصت ہو کر پھر یہاں آجاؤں گی۔ اب آپ کو دونوں صورتوں میں جو پسند ہو' اس پر عمل کریں۔ اگر آپ شام سے پہلے واپس آگئے ہوں تو غسل ضرور کر لیں۔ گرمی بہت ہے غسل کرنے سے طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ آپ کے لئے لباس استری کرنے کے بعد وراڈ روب میں رکھ دیا ہے۔ اسے پہن لیجئے گا' کولر میں برف بھری ہوئی ہے اور برف میں بیئر کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ پینے کے دوران نمکین مونگ پھلیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ کچن میں رکھی ہوئی ہیں۔ آخر میں اتنا سمجھا دوں کہ غصے کے وقت آدمی اکثر منفی انداز میں سوچتا ہے اور مسلسل جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ بیئر پینے کے دوران دماغ ٹھنڈا ہو تو مثبت انداز میں سوچئے گا۔ پھر آپ کو اپنی بیوی کی اچھائیاں یاد آئیں گی۔ تب تک کے لئے رخصت' خدا حافظ۔ آپ کی کنیز سلمیٰ۔"

وہ سلمیٰ کی تحریری ہدایات پر عمل کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن گرمی کی زیادتی کے باعث غسل کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے وہ پندرہ منٹ تک غسل خانے میں رہا.......... واپس آکر اسے وہی لباس پہننا پڑا جو سلمیٰ چھوڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہی استری کیا ہوا تھا۔ غسل کرنے کے بعد واقعی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اب پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ سلمیٰ بڑی موقع شناس تھی' اپنے شوہر کے مزاج کو خوب سمجھتی تھی۔ یوں اکثر سمجھاتی رہتی تھی کہ زیادہ نہیں پینا چاہئے لیکن آج وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے برف میں بیئر کی بوتلیں رکھ کر گئی تھی تاکہ وہ پئے اور اسے یاد کرے۔ بہرحال وہ پینے کے لئے بیٹھ گیا۔

پہلا جام شروع کرتے ہی محبوبہ یاد آتی ہے لیکن اسے بیوی یاد آنے لگی۔ اس نے دونوں بچوں کو وہاں سے لے جا کر اس کے دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا اور جانے سے پہلے اس کے لئے اتنا سارا انتظام کیا تھا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر پی سکتا تھا اور سکون سے سوچ سکتا تھا۔ جب وہ ایک ماہ تک ہسپتال میں رہا تھا تب بھی سلمیٰ نے اپنی خدمت گزاری کا خوب رنگ جمایا تھا۔ صبح و شام ہمیشہ اس کے کمرے میں رہتی تھی' اس کے پاس سوتی تھی۔ کبھی غسل کرنے کے لئے یا لباس تبدیل کرنے کے لئے ہسپتال کے پاس ہی اپنے بنگلے میں جاتی تھی' پھر واپس آتی تھی۔ اس نے ایک ماہ کے دوران اتنی خدمت کی تھی کہ پچھلے دو سال کی خدمت گزاری بھی دماغ میں تازہ ہو گئی تھی۔ تب اس نے سوچا تھا۔ سلمیٰ میں کس بات کی کمی ہے؟ اگر کوئی دوسری بیوی آئے گی تو کیا وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائے گی؟ وہ بھی تو اسی کی طرح خدمت کرے گی۔ اگر وہ خدمت گزار نہ ہوئی تو وہ دردِ سر بن

جائے گی۔ جیسا کہ عام طور پر دو بیویاں بن جایا کرتی ہیں۔

بیئر کی دو بوتلیں ختم کرنے کے بعد جب ذرا سرور حاصل ہوا تو اس نے تیسری بوتل کھولتے ہوئے اور سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔ یہ دماغ میں سلمیٰ کیوں گھسی ہوئی ہے؟ میری انجم کہاں گئی؟ ہاں! وہ کہاں چلی گئی؟ یہ سوال تو برسوں سے اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے والدین کا پتہ ٹھکانہ بتایا تھا۔ ایک بار جب وہ ڈیوٹی کے سلسلے میں خانپور گیا تو اس کی کوٹھی کے قریب سے بھی گزرا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر وحیدہ کے باپ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا۔ کیا اندر جائے وحیدہ کو ایک نظر دیکھے' اس سے ملاقات کرے لیکن تین برس تک اس سے دور رہنے کا کیا جواز پیش کرے گا؟ اگر وہ پھر اس کے گلے کا ہار بن گئی اور شادی کے لئے کہا تو مصیبت ہو جائے گی۔ گلے کا ہار بننا تو بڑی ہی خوش آئند بات ہے۔ مگر شادی کا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

وہ خانپور کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے وہیں کے ایک ملازم کو اپنا ہمراز بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہی تھی کہ وہاں وحیدہ انجم نام کی کوئی لڑکی رہتی ہے یا نہیں؟ اگر رہتی ہے تو کیا وہاں پریکٹس کر رہی ہے؟ شادی کر لی ہے؟ کیا شوہر اور بچوں والی ہو گئی ہے یا اب تک کسی کا انتظار کر رہی ہے؟ وہ بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شام کو ملازم نے آکر بتایا جن صاحب کے نام کی پلیٹ دروازے پر لگی ہوئی ہے وہ مر چکے ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو تنہا اس کوٹھی میں اپنی خادماؤں کے ساتھ رہتی ہیں اور ان کی بیٹی کراچی میں ہے۔ ابھی شادی نہیں کی۔"

"کیوں نہیں کی؟" شہریار نے پوچھا۔ "کیا کہیں سے رشتہ نہیں آتا ہے؟"

ملازم نے کہا۔ "حضور' ایسی بات نہیں ہے۔ ان کی بیٹی بڑی خوبصورت ہے۔ ڈاکٹرنی ہے۔ پھر یہ کہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے دولت میں کھیلتی ہے۔ چاروں طرف سے رشتے ہی رشتے آتے ہیں۔ میری گھر والی کہہ رہی تھی کہ وہ ڈاکٹرنی شادی سے انکار کرتی ہے۔ اس لئے کبھی خانپور اپنے رشتہ داروں کے ہاں نہیں آتی۔ ہمیشہ کراچی میں رہتی ہے۔"

شہریار کے دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ "وہ شادی سے انکار کرتی ہے۔ اب تک میرا انتظار کر رہی ہے۔ اپنے ماں باپ سے اور اپنے خاندان والوں سے بھی دور تنہا زندگی گزار رہی ہے۔"

پہلے تو اس کے جی میں آیا کہ کوٹھی میں جائے اور وحیدہ کی والدہ سے اس کا کراچی والا پتہ معلوم کرے پھر اس کے دماغ نے سوال کیا اگر اس بوڑھی خاتون نے پوچھا کہ تم کون ہو اور میری بیٹی کا پتہ کیوں پوچھ معلوم کر رہے ہو تب وہ کیا جواب دے گا؟

تب اسے بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے اور اس کی بیٹی سے کیا رشتہ رہا ہے اور جب پرانا رشتہ ظاہر ہو گا تو وہ بوڑھی خاتون نفرت سے اسے دیکھیں گی' پھر وہ یہ معلوم کریں گی کہ اس کا نام کیا ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ اسے اپنی اصلیت ظاہر کرنی پڑے گی۔ نہیں کرے گا تو وہاں کس منہ سے جائے گا؟ کس رشتے سے جائے گا؟ کس نام سے جائے گا؟

وہ خانپور سے واپس چلا گیا۔ ایک مجرم کسی کو اپنا اصلی چہرہ نہیں دکھا سکتا۔ لاہور پہنچنے کے بعد وحیدہ خوب یاد آتی رہی۔ وہ خوب اضطراب میں مبتلا رہا۔ بعد میں اس نے سوچا کہ اسی ملازم کے ذریعے وحیدہ کا کراچی والا پتہ کیوں نہ معلوم کیا۔ اگر پتہ کسی طور پر چل جاتا تو کراچی جاتا اگر وحیدہ کا سامنا نہ کر سکتا تب بھی چوری چھپے اسے دیکھتا کہ وہ کس حال میں ہے؟ کیسی ہے؟ تنہا کس طرح زندگی گزار رہی ہے؟ کچھ تو اس کے متعلق معلومات حاصل ہوتیں۔ ہو سکتا تھا پھر کسی طرح پرانی محبت کے رشتے استوار ہو جاتے۔

ایک ماہ بعد پھر خانپور جانا ہوا تو وہاں اس نے اسی ملازم سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کوٹھی میں بھیجے اور کسی طرح وحیدہ انجم کا پتہ معلوم ہو جائے۔ ملازم نے بتایا۔ "صاحب! اب تو اس کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ وہاں تالا لگا ہوا ہے۔ اس ڈاکٹرنی کی ماں بھی مر چکی ہے۔"

"اس کے کسی رشتے دار سے معلوم کرو کہ وہ کراچی میں کہاں رہتی ہے؟"

ملازم نے اپنی گھر والی کو معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے رشتہ داروں کے پاس بھیجا اور اسے سمجھا دیا کہ معلومات حاصل کرنے کے دوران بڑے صاحب کا نام درمیان میں نہ آئے۔ اس کی گھر والی سمجھ دار تھی۔ واپس آ کر بتایا کہ اس کے رشتہ دار اس ڈاکٹرنی کا پتہ نہیں جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پچھلے کافی برسوں سے انہوں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ وہ ادھر آتی ہی نہیں ہے۔ کراچی سے اگر کبھی یہاں آئے گی تو اس کا پتہ معلوم ہو گا۔

وہ نہ ملی۔ وحیدہ کی محبت میں عجیب حال تھا۔ وہ اسے تلاش بھی کر رہا تھا اور اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے دور ہی دور سے دیکھ کر نگاہوں کی پیاس بھی بجھانا چاہتا

تھا اور یہ بھی توقع کر رہا تھا کہ شاید وحیدہ پہلے کی طرح مل بیٹھے اور وہی پہلے جیسی محبت کا دور شروع ہو جائے۔

بیئر کی تیسری بوتل بھی خالی ہو گئی۔ اب نشہ کچھ جم رہا تھا نگاہوں کے سامنے وحیدہ ہی وحیدہ' انجم ہی انجم نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تلاش ختم ہو گئی ہے' جھجک مٹ گئی ہو اور اپنی وحیدہ سے سامنا کر رہا ہو۔ ایسے ہی وقت اسے وحیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے اندر جانے دو.......... ہٹ جاؤ' راستے سے۔"

وہ وحیدہ کی آواز کو لاکھوں میں پہچانتا تھا۔ اگرچہ اس سے جدا ہوئے چار برس گزر گئے تھے لیکن اس کی ادائیں نگاہوں کے سامنے اب بھی گھومتی تھیں اور اس کی آواز اب بھی کانوں میں رس ٹپکاتی تھی۔ وہ لڑ رہی تھی' جھگڑ رہی تھی۔ اس کے پاس آنا چاہتی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں کبھی کھڑکی کی طرف اور کبھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ کھڑکی اور دروازے توڑ کر اس کے پاس آنا چاہتی ہو۔

وہ نشے میں بڑبڑایا۔ "توڑ دو ان دروازوں کو جو ہمیں صدیوں سے جدا کر رہے ہیں۔ آ جاؤ میری جان.......... آ بھی جاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے ایک دھڑاکے سے دروازہ کھل گیا اور وہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگا۔ وحیدہ انجم؟ سر سے پاؤں تک وہ وحیدہ انجم ہی تھی اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ شدید حیرانی سے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

شہریار نے اپنے سر کو جھٹک کر اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا میں بہت زیادہ نشے میں ہوں؟ کیا نشے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگاؤں گا تو وہ غائب ہو جائے گی؟

وحیدہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی تھی۔ وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زبردستی دروازہ کھول کر سیلون کار میں گھسنا چاہے گی تو اسے اپنا نیکنام نظر آ جائے گا۔ کیا یہ وہی ہے؟ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا اور یقین نہ کرنے کے باوجود حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر ریلوے پولیس والوں نے اسے بتایا تھا کہ ادھر قریب ہی ڈیڈ لائن پر سیلون کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہیں اس کا بچہ حفاظت سے ہے۔ ابھی انسپکٹر صاحب آئیں گے تو اسے اس سیلون کار میں پہنچا دیں گے لیکن وحیدہ انجم' انسپکٹر کے آنے تک انتظار نہیں

کر سکتی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے‘ اسے پانے اور اسے سینے سے لگا کر چومنے کی بے چینی تھی۔ وہ وہاں خود ہی ایک قلی کو اپنے ساتھ لے کر نکلی۔ تاکہ وہ اسے سیلون کار تک پہنچا دے۔ اب وہ وہاں پہنچ کر چند لمحوں کے لئے اپنے بچے کو بھول گئی تھی۔ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ جسے چار برسوں سے گم کر دیا تھا۔ اس نے اچانک ہی سامنے آ کر ساری دنیا کو بھلا دیا تھا۔

اب وہ ایک لمحہ فیصلے کا تھا اس سے روٹھ جائے یا معاف کر دے اس کے گلے لگ جائے یا غصے سے منہ پھیر کر چلی جائے۔ ادھر چند برسوں میں اس نے کتنے ہی ڈراؤنے خواب دیکھے تھے کہ وہ آیا تھا اور چلا گیا تھا اور پھر چلا جائے گا؟ بس اسی خوف نے اسے ہلا دیا۔ وہ ایک دم سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ پھر جس کا گریبان پکڑنا تھا اس کا گریبان بن گئی۔ جس کا کلیجہ نوچنا تھا اس کے دل سے لگ گئی۔ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس لئے رونے لگی کہ وہ سمجھائے‘ منائے۔ جب ہی تو یقین ہو گا کہ وہ اپنے آنسو پونچھنے والے کے پاس پہنچ گئی ہے۔

ابھی وہ گھڑی آئے گی جب وہ اسے بری طرح جھٹک دے گی‘ اس سے الگ ہو جائے گی۔ اسے نفرت سے بے بھاؤ کی سنائے گی۔ اسے شرم دلائے گی اور اسے چھوڑ کر چلی جانے کی دھمکیاں دے گی۔ ابھی بہت کچھ ہونا تھا۔ اس لئے نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اپنے اختیار میں نہیں تھی۔

کبھی وہ اپنے.......... ہاتھوں سے اس کے چہرے کو سمیٹ کر دیکھتی تھی۔ ہاں! یہی تو وہ صورت ہے جو مجھے رلاتی ہے۔ وہ روتے روتے اس کی آنکھوں میں جھانکتی تھی۔ یہی وہ آنکھیں ہیں جو میری آنکھوں کو جگائے رکھتی تھیں۔ کبھی وہ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنے اوپر جھکا لیتی تھی۔ ہاں! یہی تو ہے وہ‘ جو میری تنہائیوں میں آ‘ آ کر مجھ پر جھک جاتا تھا اور سمجھاتا تھا کہ میں تمہارا آسمان ہوں۔ اپنی دھرتی سے سرک کر کہاں جاؤں گا؟

شہریار کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ پہلے وہ مدہوشی میں اسے پکار رہا تھا۔ اب ہوش میں اسے پا رہا تھا۔ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ان چند لمحوں میں پچھلی ساری ملاقاتوں کو یاد کر رہا تھا کہ وہ اسے پا کر کیسی پاگل ہو جاتی تھی۔ صرف اسے یاد رکھتی تھی۔ ساری دنیا کو بھلا دیتی تھی۔ آج بھی اس پر ایسی ہی جنونی کیفیت تھی۔ اس نے اسے جھنجھوڑ کر سمجھانا چاہا۔ "وحیدہ! چپ ہو جاؤ‘ دیکھو! میں ہی

تمہارے سامنے ہوں۔ میں تمہارا نیکنام ہوں چپ ہو جاؤ۔"

یک لخت وہ چپ ہو گئی۔ ایک دم سے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ اسے فوراً ہی نہ سنبھالتا تو فرش پر گر پڑتی۔ اس نے پریشان ہو کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی سمجھ میں آ گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھایا۔ پھر ایک برتھ پر لا کر اسے لٹا دیا۔

وہاں جتنی ہلچل مچی تھی۔ اتنی ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر برتھ کے قریب اس پر جھک گیا۔ اسے خوب جی بھر کر دیکھنے لگا۔ اس کی دیوانگی نے بتا دیا تھا کہ وہ اب بھی اس کی ہے۔ اس کے انتظار میں جی رہی ہے۔ اگر وہ نہ ملتا تو اسی کے انتظار میں مر جاتی اسے بڑا پیار آیا۔ اس پر قربان ہونے کو جی چاہا۔ پھر وہ قربان ہونے لگا۔

اس لمحے اسے پتہ چلا کہ محبوبہ آخر محبوبہ ہوتی ہے۔ اسی کے لئے جیتی ہے‘ اسی کے لئے مرتی ہے اور ایک بیوی ہے جو اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ اب سلمیٰ اس کی نظروں سے گر رہی تھی وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ وحیدہ کو کہیں نہیں جانے دے گا‘ اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے گا۔ سلمیٰ نے ذرا بھی اعتراض کیا تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔

اچانک اسے عقل آئی کہ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اسے ہوش میں لانا چاہئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف گیا۔ وہاں سے فوراً ہی ایک گلاس پانی لے کر آیا۔ پھر پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارنے لگا۔ ذرا سی دیر میں وحیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ پھر وہ اپنے سر کو دائیں سے بائیں حرکت دینے لگی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ شہریار اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ دھڑکتے دل سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت اس کے لبوں پر اپنے نیک نام کا ہی نام ہو گا۔ وہ گلاس کو ایک طرف رکھ کر پھر کان لگا کر سننے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ آواز دے رہی تھی۔ "کبیر.......... کبیر.......... تم کہاں ہو؟"

اس کا منہ لٹک گیا۔ ساری خوش فہمی خاک میں مل گئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اتنے برسوں میں وحیدہ نے صرف اسے یاد کیا ہے۔ اب پتہ چل رہا تھا کہ کوئی کبیر اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے وقت اسی کا نام اس کے لبوں سے سنائی دے رہا تھا۔ وہ بولنے لگی۔ "میرے بیٹے! میرے بچے! تم کہاں ہو؟ اپنی ماں کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے میرے لال؟"

وہ حیران رہ گیا۔ کیا یہ ماں بن گئی ہے؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ گویا اس نے میرے انتظار میں یہ دن نہیں گزارے۔ کوئی اس کا جیون ساتھی ہے' اس کی کوئی اولاد ہے جسے وہ یاد کیے جا رہی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے یقینی سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ دل نہیں مانتا تھا کہ یہ حسینہ جو اس کی رہی تھی کسی اور کی ہو گئی ہے۔

وحیدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے وہ ماحول اجنبی سا لگا پھر شہریار کی موجودگی نے ساری اجنبیت دور کر دی۔ سب کچھ یاد آ گیا کہ ابھی وہ اس کی پناہ میں رو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ لیٹی رہی۔ اپنے اندر کمزوری محسوس کرتی رہی۔ پھر ایک کہنی برتھ پر ٹیک کر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ اس نے برتھ کی پشت سے ٹیک لگا کر شہریار کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم.......... تم یہاں کیسے ہو؟ یہاں کس حیثیت سے ہو؟ چیف مکینیکل انجینئر کون ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "پہلے تم بتاؤ۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ تم ابھی کسی کا نام بڑبڑا رہی تھیں۔ پھر اپنے بچے کو پکار رہی تھیں۔ کیا تم کسی بچے کی ماں ہو؟"

وحیدہ نے اپنے دونوں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اسے ذرا دیر غصے سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تمہارے جھوٹ اور فریب نے' تمہاری بے وفائیوں نے مجھے اتنی عقل دی ہے کہ لڑکیوں کو پہلے دوسرے کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہئے۔ اپنے سوال کا جواب طلب کرنا چاہئے جب میں تم سے ملا کرتی تھی تو تمہارے ہر سوال کا جواب دیا کرتی تھی۔ اپنے متعلق بتاتی چلی جاتی تھی۔ تمہارے متعلق پوچھتی تو تم جواب دینے کے بجائے ٹال دیتے' بہلا دیتے اور میں بہل جاتی اب تمہارے کسی سوال کا جواب تمہیں اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک میرے سوال کا جواب تم نہیں دو گے۔"

شہریار نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ پہلے اپنے سوالوں کا جواب سن لو۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا' تمہیں دھوکہ دیا تھا۔ جب تم سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو اس وقت میری شادی کو دو سال گزر چکے تھے۔ میں ایک بہت عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس وقت ایک جونیئر آفیسر تھا جگہ جگہ دورے پر جاتا تھا' ماحول بدلتا تھا' مزاج بدلتا تھا اور بری عادتوں کو اپناتا رہتا تھا۔ میں شراب اور شباب کا عادی ہوتا گیا۔ جب تمہیں دیکھا تو تمہارا دیوانہ ہو گیا۔ ارادہ تھا کہ تمہیں بیوقوف بنا کر' تم سے کھیل کر' تمہیں بھی چھوڑ دوں گا لیکن تمہیں چھوڑنے کے بعد میں سکون سے نہیں رہ سکا۔ تم پہلی عورت ہو جو مجھ جیسے عیاش آدمی کو بار بار یاد آتی

رہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ دو بار خانپور گیا اور ایک ملازم کے ذریعے تمہارے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ خود جا کر تمہاری والدہ سے ملتا۔ جب دوسری بار گیا تو تمہاری والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بہرحال میں تم سے کترانے کے باوجود تمہیں تلاش کرتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بیوی میرے پاس ہوتی اور میں تمہارے پاس ہوتا۔ باتیں اس سے ہوتیں اور پیار تم سے کرتا۔ وہ روٹھ جاتی تو میں تمہیں منانے لگتا۔ میں نے اپنی شریکِ حیات کی خوشیوں کا ایک ایک لمحہ چرا کر تمہیں دیا ہے اور تمہیں تلاش کیا ہے۔ کاش کہ تم نہ ملتیں۔ مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم کسی کے بچے کی ماں بن گئی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔ "مجھے گالی مت دو۔ میں تمہارے بچے کی ماں ہوں۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے نیکنام! تم نے مجھے بدنامیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے بچوں کی خاطر میں اپنے ماں باپ سے چھوٹ گئی۔ اپنے رشتہ داروں سے اب تک منہ چھپاتی پھر رہی ہوں' دنیا والوں سے کتراتی ہوں' کوئی سوسائٹی نہیں اپناتی کسی بھی سوسائٹی میں جاؤں گی تو مجھ سے میرے بچے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مجرم تم ہو' سزا میں پا رہی ہوں۔ میں یہ سوچ کر صبر کر لیتی تھی کہ شاید تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔ میرے پاس پہنچنے سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے ہو اور اگر کہیں ہو تو بڑی مجبوریوں میں گرفتار ہو۔ جب بھی تمہاری مجبوریاں ختم ہوں گی تو میرے پاس ضرور آؤ گے بس' انہی خیالوں میں خود کو بہلاتے ہوئے میں نے اتنا عرصہ گزار دیا ہے۔"

وہ یک بیک چیخ پڑا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں کیسے یقین کروں کہ تم نے میرے بعد شادی نہیں کی؟ اگر شادی نہیں کی تو کسی اور کو اپنا نہیں بنایا؟ کیا ثبوت ہے کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں۔ کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟"

وہ پہلے تو بالکل سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کبھی وہ ملے گا تو اپنے بچوں کا باپ بننے سے انکار کرے گا۔ اس پر اس طرح الزام عائد کرے گا۔ پھر وہ بھی بپھر گئی۔ "دیکھو! میں پہلی اور آخری بات سمجھاتی ہوں کہ مجھے کوئی بازاری عورت نہ سمجھنا۔ میں نے اپنی جوانی' اپنی پارسائی' اپنے ماں باپ کا اعتماد اور اپنی انا' سب کچھ تم پر قربان کر دی۔ اس کے باوجود تم مجھے ذلیل کرو گے تو میں تمہاری محبت کو طاق پر رکھ دوں

گی اور تمہیں عدالت تک گھسیٹتے ہوئے لے جاؤں گی۔ میں کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں کہ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنی عزت کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں۔ تم ایک عزت دار آدمی ہو۔ ریلوے کے ایک بہت بڑے آفیسر ہو۔ میں ایک بہت معروف لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ نہ تمہیں بے وجہ بدنام کر سکتی ہوں اور نہ تمہیں بدنام کرنے کی سازش میں خود کو دنیا کے سامنے تماشہ بنا سکتی ہوں۔ اگر میں یہ ثابت نہ بھی کر سکی کہ ان بچوں کے باپ تم ہو۔ تب بھی تمہیں دنیا والوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھوں گی۔"

شہریار نے غصے میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر بند کر لیا۔ اچانک ہی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ بارود کے ایک ڈھیر کے سامنے کھڑا ہوا ہے' مخالفت کی ذرا سی بھی چنگاری دکھائے گا تو ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔ اوہ! بیوی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اس پر کتنی ہی دھونس جماؤ' چوں نہیں کرتی۔ اس وقت سلمٰی یاد آ رہی تھی وہ بے بسی سے وحیدہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ الٹے پاؤں اپنے پیچھے ایک برتھ پر بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔ وحیدہ نے پوچھا۔ "ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

شہریار نے ایک جھٹکے سے سر کو اٹھایا۔ وہ لفظ ہمارا پر اعتراض کرنا چاہتا تھا۔ پھر عقل آ گئی۔ اس نے سر کو جھکا کر سوچا۔ وحیدہ ایک بچے کی بات کر رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم ہے کہ دوسرا بچہ بھی میرے پاس پرورش پاتا رہا ہے اور اس نے دونوں کو ناجائز کہہ کر سلمٰی کو ان کے ساتھ یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اب وہی ناجائز بچے میرے ہو رہے ہیں۔ کیا یہ میرے ہیں؟ کیا میں انہیں تسلیم کر لوں؟

وہ اپنے اندر جھانکنے لگا۔ اس کے ضمیر نے کہا۔ "بے شک وحیدہ کو دیکھو' اس کی محبت کو اور اس کے مزاج کو سمجھو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی تھی۔ مجھ سے دھوکہ کھانے کے بعد کسی سے بھی شادی کر کے اپنا ایک گھر بسا سکتی تھی۔ وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس بچے کو ضائع کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ محبت کی ماری محبت میں مر گئی۔ اب میں اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہوں۔ اعتماد نہ کروں تب بھی مجھے نجات نہیں ملے گی۔ یہ کوئی ایسی ویسی نہیں ہے جو کہہ رہی ہے' کر دکھائے گی۔ جہاں میرے لئے برسوں انتظار کیا ہے اور اس بچے کی پرورش کی ہے' وہاں وہ بچے کو جائز حقوق دلانے کے لئے عدالت تک بھی پہنچ جائے گی' خود کو تماشہ بنائے گی مگر اپنی بات منوا کر رہے گی' نہیں منوا سکی تو مجھے ہر جگہ بدنام کرتی پھرے گی۔ میں کتنوں کو جواب دیتا رہوں گا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ سوسائٹی میں میرا ریکارڈ کچھ اچھا تو نہیں ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر وحیدہ کو دیکھا' وہ بولی۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہ ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

"میری وائف اسے اپنی بہن کے ہاں لے گئی ہے۔"

"کیوں لے گئی ہے؟ یہاں میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"میں کسی کے بچے کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بہن کے گھر میں اس بچے کے ساتھ رہے۔ جب اس کے ماں باپ آئیں گے تو وہیں سے لے جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "تمہاری ہچکچاہٹ سے یوں لگتا ہے' جیسے تم کچھ چھپا رہے ہو۔ دیکھو' مجھے میرا بچہ واپس لا دو۔ تم نے پہلی بار مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرو گے۔ میں آج اسی خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔ میں نے ایک نہیں تمہارے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ وہ جڑواں تھے' بعد میں آپریشن کے ذریعے انہیں الگ الگ کیا گیا۔ میں تمہاری شرافت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اگر تم کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو' ایک خدا پر بھروسہ کرتے ہو' ایک آخری رسول ﷺ کو مانتے ہو تو مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں جو اتنے عرصے تک تمہارا انتظار کرتی رہی' تمہارے بچے کو پالتی رہی تو یہ محض میری محبت کی دیوانگی نہیں تھی' میری ممتا کا تقاضہ بھی تھا کہ میں ہمارے بچے کو تمہارا نام دوں اور میں یہ نام دے کر رہوں گی۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں برتھ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ "مجھے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ بہت سی باتیں سوچتا ہوں' تو تم سچی نظر آتی ہو۔ تم چاہتیں تو ان بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی انہیں مٹا دیتیں۔ مگر تم نے میری محبت میں' میرے انتظار میں انہیں جنم دیا۔ میری خاطر بدنامیاں مول لیں۔ سوچتا ہوں کہ قدرت نے عجب تماشہ دکھایا ہے میرے ایک بچے کو میرے ہی پاس پرورش کرنے کے لئے بھیج دیا۔ میرے والد کی سرپرستی میں ان بچوں نے جنم لیا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ مجھے اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔"

وحیدہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ایک بہت ہی شفیق بزرگ تھے بہت ہی شریف گھرانے کے لوگ تھے۔ وہ اور ان کی بہو نے جیسا میرا ساتھ دیا ہے' ویسا کسی خون کے رشتے نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا ایک بچہ اسی شریف عورت کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔"

شہریار نے تائید میں سر ہلایا کہا۔ "ہاں! اس خاتون کا نام سلمٰی ہے اور ان بزرگ کا نام ملک دین محمد تھا۔"

وہ حیرانی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بولی۔ "تم کیسے جانتے ہو؟ کیا............؟ کیا............؟"

"ہاں! ملک دین محمد میرے والد ہیں اور سلمٰی میری بیوی ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تو پھر تم اپنے دونوں بچوں کو تسلیم کر رہے ہو؟"

"ہاں! بچوں کی تاریخ پیدائش کے حساب سے تم نے میرے ہی بچوں کو جنم دیا ہے۔ جب میں آخری بار تم سے مل کر گیا اور حادثے کا شکار ہوا تو اس کے تقریباً نو ماہ کے بعد یہ پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت تک میرے علم کے مطابق اور میرے اعتماد کے مطابق تمہاری زندگی میں میرے سوا کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میرے بچے ہیں۔"

وحیدہ نے خوش ہو کر اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ پہلے محبوب ملا تو وہ خوشی اور تھی۔ اب بچوں کا باپ ملا تو مارے خوشی کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہریار نے قدموں سے اٹھا کر اسے دل سے لگا لیا۔ اگر ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ درست ہے کہ وہ آئندہ باپ نہیں بن سکتا تو پھر وحیدہ نے اسے دو بچوں کا باپ بنا دیا تھا۔ اب وہ لاولد نہیں رہے گا۔ وحیدہ سے اسے بچھڑی ہوئی محبت مل رہی تھی' بچے مل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار اسے اپنا رہا تھا۔ وحیدہ کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ساری شکایتیں' ماضی کی جفائیں بھول کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ آج اس کے لئے عید کا دن تھا۔ آج اپنے محبوب کے ساتھ اپنا دوسرا بیٹا بھی ملنے والا تھا۔ ایسے وقت وہ سلمٰی کو بھول گئی تھی۔

اسی وقت دروازے پر سلمٰی کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر الگ ہو گئے۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ سلمٰی کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بڑے صبر اور تحمل سے ان کے ملاپ کا تماشہ دیکھتی رہی تھی۔ اس نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ "یہاں تک تو بہت اچھی فلمی کہانی بن گئی۔ ایک ہیرو اپنے بچوں کا باپ بنتا ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی۔ ہیرو کے باپ کی سرپرستی میں بچے جنم لیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک بچہ ہیرو کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ آخر میں ہیروئن بھی آ کر مل جاتی ہے۔ تماشہ دیکھنے والے ہنسی خوشی گھر چلے جاتے ہیں لیکن یہ فلم کا نہیں' زندگی کا تماشہ ہے جو اب شروع ہو گا۔ اب کیا ہو گا میرے سرتاج؟ میرے ہوتے ہوئے آپ دوسری عورت کو گلے کیسے لگائیں گے؟ آپ ان ناجائز بچوں کے باپ کیسے بنیں گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے وحیدہ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "بہن! میرے بچے کہاں ہیں؟"

سلمٰی نے جواب دیا۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ بچے خیریت سے ہیں۔ میرے شوہر نے حکم دیا تھا کہ وہ ناجائز ہیں انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ جب تک بچوں کی ماں نہ ملے میں ان بچوں کے ساتھ اپنی بہن کے ہاں رہوں لیکن یہاں سے نکل کر مجھے خیال آیا کہ میری بہن ان میں سے ایک بچے امیر کو ہمارا بچہ سمجھتی ہے۔ دوسرے مشکل کبیر کو دیکھے گی تو طرح طرح کے سوال کرے گی۔ پھر مجھے شوہر کے حکم کے مطابق امیر سے بھی تو دستبردار ہونا ہے۔ بہن کے ہاں جانے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔"

وہ بولتے ہوئے اندر آئی۔ دروازے کو بند کیا۔ پھر کہنے لگی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ اپنے ہی مرد کے گناہ کو چھپانے کے لیے اپنی بہن کے ہاں جانے سے ڈر رہی ہوں۔ میں وہاں نہیں گئی۔ پھر کہاں جاتی؟"

اس نے شہریار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہاں بچوں کو لے کر واپس بھی نہیں آ سکتی تھی۔ آخر میں نے ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ وہاں دونوں بچوں کو آیا کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ ارادہ تھا کہ پھر آپ کی خوشامد کروں گی۔ آپ کے قدموں میں گر کر امیر کو اپنا لینے کی التجا کروں گی۔ میں محبوبہ تو نہیں ہوں کہ قدموں میں گراؤں گی۔ بیوی ہوں گرنے ہی کی بات سوچ سکتی ہوں۔"

شہریار نے کہا۔ "اب تم بولو گی۔ میری ایک کمزوری تمہارے ہاتھ آ گئی ہے۔"

وہ بولی۔ "میری کوئی کمزوری نہیں ہوتی تب بھی آپ بولتے ہیں۔"

وحیدہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ ندامت سے بولی۔ "بہن! ابھی میں نے ان کی زبان سے آپ کا نام سنا تو بڑی حیران ہوئی۔ دوسرے لمحے وہ حیرانی خوشی میں بدل گئی کہ میں یہاں اپنے دوسرے بیٹے امیر کو پاؤں گی۔ اسے مدتوں بعد سینے سے لگا کر چوم سکوں گی۔ سچ ہے انسان خواہ کتنا ہی پُرخلوص اور ملنسار ہو وہ اندر سے تھوڑا خود غرض ہوتا ہے۔ یہ میری خود غرضی ہے کہ میں آپ کے احسانات کو بھول کر اپنے نیک نام کی قربت سے بہلتی چلی گئی۔ یہ بھی بھلا دیا کہ یہ نیک نام میری محسنہ کا جیون ساتھ ہے۔"

سلمٰی نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا' یہ بڑی بات ہے۔ اب میرے ساتھ ہوٹل چلو اور اپنے دونوں بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔ میرے شوہر جس چیز کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں' میں اسے اپنے گھر میں

نہیں رکھ سکتی۔"

وحیدہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا اتنے عرصے تک امیر کو سینے سے لگائے رکھنے کے بعد آپ اسے آسانی سے چھوڑ سکیں گی؟"

سلمٰی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اپنی آواز میں آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے بولی۔ "میں نے پرائی اولاد کو اتنا پیار دیا یہ میری نادانی تھی مجھے پہلے ہی سمجھنا چاہیے تھا کہ میں ماں نہیں' ایک پالنا ہوں۔ بچہ پالنے سے لڑھک کر اپنی ماں کی گود میں گرتا ہے۔ پالنا تو خالی ہی رہ جاتا ہے۔"

شہریار نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "تم خالی نہیں رہو گی۔ اب صرف امیر ہی نہیں' کبیر بھی تمہارا ہے۔ تم دونوں بچوں کو محبت اور مامتا دے سکتی ہو۔ اب میں اعتراض نہیں کروں گا۔"

"کیا آپ کے اعتراض نہ کرنے سے وہ بچے جائز ہو جائیں گے؟ کیا گناہ دھل جائیں گے؟ کیا آپ دونوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اپنے رسول ﷺ کی شریعت کے مطابق نکاح پڑھالیا تھا؟ کیا آپ نے ان دونوں بچوں کو پیدا کرنے کے لیے دین اور دنیا کی رضامندی حاصل کی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو اب آپ اخلاق اور تہذیب کی کون سی نئی کتاب کھولیں گے؟ مجھ جیسی اندھا اعتماد کرنے والی بیوی کو کون سا نیا سبق پڑھائیں گے؟"

وحیدہ نے سلمٰی کے ہاتھوں کو تھام کر عاجزی سے التجا کی۔ "بہن! میرے بچوں کو ناجائز نہ کہیں' کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اگر یہ الزام نہ مٹا تو یہی بچے بڑے ہو کر مجھ پر تھوکیں گے۔"

شہریار نے بھی ذرا عاجزی سے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں ہم پر بہت زیادہ غصہ آرہا ہے۔ اس وقت تمہارے دماغ میں آندھیاں چل رہی ہوں گی۔ تم جب تک ہم پر کیچڑ اچھالتی رہو گی' ہم برداشت کرتے رہیں گے۔ ہم خطا کار ہیں' ہمیں برداشت کرنا ہی ہو گا لیکن تمہارے غصے اور نفرت کی ایک انتہا ہو گی۔ ہر چیز فنا ہوتی ہے۔ تمہارا غصہ بھی ایک دن فنا ہو گا۔ تم ہم پر نفرت کا آخری لفظ بھی تھوک دو گی۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ نہیں کبھی نہیں۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ تم میری ہی چوکھٹ پر جان دینے والی عورت ہو۔"

وہ غصے سے شہریار کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "فی الحال یہ بتاؤ کہ بچے کس ہوٹل میں

ہیں؟ میں انہیں واپس لے کر آؤں گا۔ اس بہانے تم دونوں سے ذرا دور چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد تم اور وحیدہ یہاں تنہائی میں بیٹھ کر موجودہ حالات کو سمجھو اور مصلحت اندیشی سے سوچو کہ........"

وہ اب جو بات کہنا چاہتا تھا اس کے لیے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے حوصلے کو ذرا جوان رکھنے کے لیے وحیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ......... ہم تینوں ایک......... ایک ساتھ......... یعنی کہ ایک ساتھ........."

یہ کہتے ہوئے اس نے سلمٰی کو دیکھا تو بات حلق میں اٹک گئی۔ مطلب کی بات بول نہ سکا۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ہوٹل کا پتہ اور کمرہ نمبر بتاؤ؟"

سلمٰی نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا' جیسے ہوٹل کے پتے کو باہر نکلنے سے روک رہی ہو۔ ابھی وہ لڑائی کو جاری رکھنا چاہتی تھی۔ بحث کرنا چاہتی تھی کہ وہ بچے ناجائز ہیں۔ انہیں گود میں لینے کیوں جا رہے ہو؟ لیکن دماغ نے سمجھایا کہ وہ صدیوں تک لڑتی رہے گی تب بھی جیت نہیں سکے گی۔ اسے اپنے اندر ذرا سی لچک پیدا کرنا چاہیے' حالات سے تھوڑا سمجھوتہ کرنے کا انداز اختیار کرنا چاہیے' وہ منہ گھما کر بولی۔ "ہوٹل دلشاد کمرہ نمبر دس۔"

شہریار اپنی جگہ سے پلٹ کر تیر کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ سلمٰی کے ڈوبتے دل نے کہا۔ "وہ محض بچوں کو لانے ہی نہیں گئے میرے لیے گڑھا کھودنے گئے ہیں۔ وہاں مجھے دفن کیا جائے گا۔ پھر میری قبر کی چھاتی پر میری سوکن کو بٹھایا جائے گا۔"

اس خیال سے سر چکرانے لگا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ آہستہ آہستہ قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وحیدہ اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک دونوں کے سر جھکے رہے۔ وہ اپنے اندر جیسے لڑ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے نظریں اٹھا کر ایک دوسری کو دیکھا تو بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ تعجب ہے' کرتا کوئی ہے روتا کوئی ہے۔ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہاں کوئی ان کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ انہیں خود ہی رونا تھا' خود ہی چپ ہونا تھا۔ وحیدہ نے ہچکیاں لے لے کر کہا۔ "آپ نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ مجھے آپ کی ازدواجی زندگی میں آگ نہیں لگانا چاہیے۔ اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے چلی جانا چاہیے۔ مگر میں کیا کروں؟ وہ صرف آپ کے شوہر ہی نہیں میرے مجرم بھی ہیں۔

انہوں نے جس بری طرح مجھے برباد کیا ہے۔ وہ سارا قصہ آپ جانتی ہیں۔ آپ خود فیصلہ کریں۔ کیا میرے ساتھ انصاف نہیں ہونا چاہیے؟"

سلمٰی نے روتے روتے کہا۔ "میں کہانیاں لکھنے والی ہوتی تو تمہاری حمایت میں قلم اٹھاتی۔ وکیل بیرسٹر ہوتی تو عدالت میں تمہارے حقوق کے لیے لڑنا شروع کر دیتی لیکن سب سے پہلے میں عورت ہوں۔ ایک سوکن کے حقوق کے لیے کیسے لڑوں؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"آپ کی طرح ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتی۔ آپ اپنی جگہ قابلِ رحم ہیں۔ میں اپنی جگہ فریاد کناں ہوں۔ اپنے لیے انصاف چاہتی ہوں۔ ہمارا انصاف کون کرے گا؟ ہمارا انصاف تو ہمارا مرد ہی کرتا ہے نا؟"

"اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے مجبوراً سمجھوتہ کرنے کے لیے یہاں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہے۔ میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا سکتی ہوں مگر اپنے شوہر کو تمہاری طلب سے باز نہیں رکھ سکتی۔ تمہاری مظلومیت نے اور ان بچوں نے اُن کا پلہ بھاری کر دیا ہے۔"

وحیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو تسلیم نہیں کریں گے تو میں انہیں عدالت میں چیلنج کروں گی۔ خود بدنام ہوں گی اور ان کی نیکنامی کی دھجیاں اڑاؤں گی۔ مگر ہم صرف دھمکیاں دے سکتی ہیں دعوے کر سکتی ہیں۔ عمل نہیں کر سکتیں۔ اپنے مرد کے آگے اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد اسے جیتنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف جھکا ہوا سر رہ جاتا ہے۔ ہمارے لیے تو ان کی بدنامی ہماری بدنامی ہوتی ہے' ان کی عزت پر اپنا سر ننگا لگتا ہے۔"

سلمٰی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "ہم دونوں کو جھکنا ہے۔ آج نہیں تو کل جھکنا ہے۔ ابھی وہ جاتے وقت ٹھیک ہی کہہ گئے ہیں کہ جب میرے غصے اور نفرت کی انتہا ہو جائے گی تو میں تھک ہار کر ان ہی کی چوکھٹ پر مرنے کے لیے بیٹھی رہ جاؤں گی۔"

وہ پھر رونے لگی۔ وحیدہ سرکتے ہوئے قریب آ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے۔ وہ اور ٹوٹ ٹوٹ کر رونے لگی۔ وحیدہ اس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر تسلیاں دینے کے انداز میں تھپکنے لگی۔ سلمٰی جیسے ڈوب رہی تھی۔ سہارا لے رہی تھی۔ اس سے لپٹ رہی تھی۔ بلک بلک کر کہہ رہی تھی۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی کہاں ہوتی ہے۔ انہیں تو اپنی کرنی کے بدلے دو تمغے مل رہے ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ مرد بڑے باکمال ہوتے ہیں۔ ہمیشہ نیک نام رہتے ہیں۔"

☆=========☆=========☆

آئندہ بانو

انسان ہمیشہ آئندہ کی سوچتا ہے اور اپنی آئندہ کو سنہرا بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ آئندہ کو تابندہ کرنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز کام کر گزرتا ہے۔ ایک شخص کا قصہ جو آئندہ کو نہیں مانتا تھا۔

جو دیکھتا تھا اسی کا ہو جاتا تھا مگر وہ کسی کی نہیں ہوتی تھی۔ جب سے پیدا ہوئی تھی مغرور تھی۔ اسے اپنی قدر و قیمت خوب معلوم تھی۔ اپنے حسن پر بڑا ناز تھا۔ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ آتی بھی تو نکل جاتی تھی۔ بڑی بھاگ دوڑ' محنت اور جانفشانی کے بعد وہ سیٹھ سلطان چنے والا کے ہاتھ لگی تھی۔

اس کا نام آئندہ بانو تھا۔ نام اگرچہ منفرد تھا لیکن نہایت ہی خوبصورت اور دلنشین تھا۔ ازل سے انسان آئندہ کے خواب دیکھتا آیا ہے۔ وہ سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک نہایت حسین اور جاذب نظر تھی جو اسے دیکھتا تھا' بے اختیار کہتا تھا۔ "یہ آئندہ ہماری ہوگی۔" اور آئندہ اسے حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی سی کوشش کرتا رہ جاتا تھا۔

ہمارے ہاں حُسن کے پیچھے بھاگنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے قدرداں کم کم ہیں۔ بے قدری اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ آئندہ بانو شادی کے بعد سیٹھ سلطان چنے والا کے حوالے سے بیگم آئندہ چنے والا کہلانے لگی تھی۔ کہاں حسن کہاں چنا' یُوں لگتا تھا جیسے چنے کو گھوڑے کے منہ سے چھین کر ایک حسینہ کے منہ تک پہنچا دیا گیا ہو۔

سیٹھ چنے والا بڑے فخر سے کہتا تھا۔ "ہمارے دادا چنے کا ستّو کھاتے آئے ہیں' یہ گھوڑوں کی نہیں انسانوں کی خوراک ہے۔ آج کی نئی نسل اس کی اہمیت اور افادیت کو ختم کرنا چاہتی ہے ورنہ جس طرح ہمارا قومی کھیل ہاکی ہے' قومی پھول چنبیلی ہے' قومی شوق وی سی آر اور قومی بجٹ مہنگائی ہے۔ اسی طرح چنے کو قومی غذا قرار دینا چاہئے۔"

آئندہ بانو جب سے چنے والا کے گھر آئی تھی۔ اس گھر کا چھپر پھٹ گیا تھا۔ دولت ہی دولت برس رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور اپنی بیگم پر قربان ہو کر پوچھتا تھا۔ "میری پیاری آئندہ! کیا آئندہ بھی چھپر پھٹتا رہے گا؟"

آئندہ نے اپنے میاں کا حُلیہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "بنیا آخر بنیا ہوتا ہے وہ دھن کے لئے جان دے دیتا ہے' تن کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے۔ میلی قمیض' گندی جیکٹ صدری اور پھٹا ہوا پجامہ۔"

وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا۔ "میری آئندہ! دُنیا والوں کے سامنے مسکین بن کر

رہنا چاہئے۔ میں یہ تاثر دیتا ہوں کہ میرا پجامہ پھٹ رہا ہے چھپر نہیں پھٹ رہا ہے۔"

"فضول باتیں ہیں۔ مسکین بن کر رہنا کیا ضروری ہے؟ کیا دُنیا والے تم سے انکم ٹیکس طلب کرتے ہیں؟"

"دنیا والے نہ سہی' انکم ٹیکس والے تو پیچھے پڑ جائیں گے۔"

آئندہ نے فخر سے سر اونچا کیا۔ پھر بڑے یقین سے کہا۔

"تمہاری نئی دولت مندی کا یہ سال پورا ہونے دو۔ میں ٹیکس مانگنے والوں کو چٹکی بجا کر ٹھنڈا کر دوں گی۔"

وہ بڑے ناز و انداز سے چلتے ہوئے قدِ آدم آئینے کے سامنے آئی۔ پھر اپنے حسنِ سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ سیٹھ سلطان چنے والا تیزی سے چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ پھر آئینے میں جھانکتا ہوا بولا۔

"تم حسین ہو میرے لئے' جوان ہو میرے لئے' بیوی ہو میرے لئے' کیوں' میرے لئے ہو نا؟"

آئینے کی آغوش میں ملکۂ حُسن کے تیور بدل گئے' بھویں تن گئیں۔ اس نے کہا۔

"عورت کی زبان سے وفا کا اقرار کرانے والے احمق ہوتے ہیں۔ یاد رکھو' عورت آتی جاتی سانس کی طرح ہے۔ سانس لیتے رہو گے وہ سینے کو گرماتی رہے گی۔ سانس کو بھُول جاؤ گے وہ زندگی کی طرح روٹھ کر چلی جائے گی۔"

"میں یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں کہ تم نے میری کایا کیسے پلٹ دی۔ جب سے آئی ہو میرے کاروبار کو سنبھال رکھا ہے۔ مانتا ہوں' تم بہت علم رکھتی ہو۔ میرے پاس علم تھوڑا اور تجربہ زیادہ ہے۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے بنک سے اتنا بڑا قرضہ کیسے لے لیا۔ انہوں نے ادائیگی کے متعلق کچھ پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تھا۔ میرا نام بھی آئندہ ہے۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔"

"جب جانتے ہو تو اتنا نہیں جان سکتے کہ انہوں نے ادائیگی کے لئے آئندہ کی تاریخ دی ہے۔ تاریخ بدلتی رہے گی۔ آئندہ اپنی جگہ قائم رہے گی۔"

"تم بہت ہنر مند ہو۔"

"مرد ہنر مند ہو اور وہ کما کر لاتا ہو تو عورت گھر سنبھالتی اور سنوارتی ہے۔ میں ہنر مند ہوں۔ تمہاری دولت میں اضافہ کر رہی ہوں۔ تمہیں اپنا اور گھر کا حلیہ درست رکھنا

چاہئے۔ کیا تم اتنے سے گھر کو سنبھال نہیں سکتے؟"

رفتہ رفتہ میاں کا اور گھر کا حلیہ بدلنے لگا۔ وہ مکان پرانی حویلی کی طرح کا تھا جسے جدید طرز کی کوٹھی میں تبدیل کیا گیا۔ اندر اور باہر رنگا رنگ پلاسٹک پینٹ کے ذریعے اسے چمکایا گیا۔ اس کوٹھی میں دنیا جہان کے قیمتی صوفے بیڈ اور دوسرے فرنیچر آ گئے۔ بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری محکمہ جات کے افسران اس کوٹھی میں آنے لگے۔ جو صاحب آتے تھے وہاں کا آرائشی سامان دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ سیٹھ سلطان چنے والے کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ جدید تراش کے لباس میں نظر آتا تھا۔ کبھی خاص تقاریب میں سوٹ اور نکٹائی بھی پہن لیتا تھا۔

یہ سچ ہے' باہر کے لوگ کسی بھی شخص کو باہر سے بدل سکتے ہیں' اندر سے بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت سے مجبور رہتا ہے۔ خوش قسمتی سے اتنی حسین و جمیل شریکِ حیات ملی تھی لیکن آج تک اس بنئے کو حسن کی تعریف کرنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا۔ ایک بار وہ کسی خاص تقریب میں جا رہے تھے۔ آئندہ بانو نے ایسا غضب کا سنگھار کیا تھا کہ آنکھیں اسی پر ٹھہر جاتی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں رُک جاتی تھیں۔ سیٹھ سلطان چنے والا نے اسے بڑے شوق سے دیکھا۔ شاید پہلی بار ایسے دیکھ رہا تھا۔ آئندہ بانو خوش ہوگئی' وہ بھی مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ سیٹھ چنے والا نے فوراً ہی لپک کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ ایک دم سے بھڑک گئی۔ غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔ "تم ہاتھ پکڑ رہے ہو۔ لعنت ہے تمہارے رومانس پر......... دُور ہٹو۔"

وہ جھینپ گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا پیچھے ہٹ گیا......... دونوں ہاتھ باندھ کر یوں ادب سے کھڑا ہو گیا جیسے غلام مالکہ کے حکم کا منتظر ہو۔ وہ ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"عورت اور دولت صرف مردانہ مٹھی میں رہتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہاتھ باندھ کر سر جھکائے رکھنے والے غلاموں کو نہ کبھی حُسن ملا نہ......... کبھی دولت۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ ورنہ کسی دن پھُر سے اُڑ جاؤں گی اور تم گھر کو خالی پنجرہ سمجھ کر دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

اس نے دل ہی دل میں تسلیم کیا۔ "اگرچہ یہ عورت میرے اختیار سے باہر ہے۔ اس کے باوجود میرے اختیار میں رہتی ہے۔ میری ہر بات مانتی ہے۔ یہ چاہے تو آج مجھے چھوڑ کر چلی جائے مگر نہیں جاتی۔ اس کا مطلب ہے مجھے چاہتی ہے' مجھ سے وفا کرتی ہے۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عورت کی زبان سے وفا کا اقرار نہیں کرانا چاہئے۔ اس کی عادتوں سے، اس کے مزاج سے اور اس کی خدمت گزاری سے پرکھنا چاہئے۔"

ایک سال گزر گیا۔ ایک صبح وہ آئندہ بانو کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ملازم ٹیلیفون اُٹھا کر وہاں لے آیا۔ اس نے ریسیور کان سے لگا کر سنا۔ پریشان ہوگیا۔ پھر اس ریسیور کو آئندہ بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انکم ٹیکس کا آفیسر ہے۔"

وہ ریسیور کان سے لگاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "ہیلو، میں آپ کی آئندہ، کنیز ہوں۔ آپ کا ارسال کیا ہوا نوٹس مل چکا ہے۔ ہمیں دھمکی دی گئی ہے کہ انکم ٹیکس اور جائیداد ٹیکس وغیرہ کی مد میں مقررہ تاریخ تک پانچ لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے ورنہ.........."

وہ بات ادھری چھوڑ کر ہنسنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ "ہمارے حساب کے ساتھ وہ رپورٹ بھی درج ہے جو اس نئی کوٹھی کے متعلق ہے۔ آپ نے شاید اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے اس کوٹھی کی جگہ پہلے بہت بڑا گودام تھا۔ پچیس لاکھ روپے کے چنے گودام میں تھے۔ اچانک آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچیس لاکھ کی رقم جل کر خاک ہوگئی۔"

وہ کچھ سُننے کے لئے ذرا خاموش ہوئی۔ پھر کہنے لگی۔ "آپ اسے جھوٹی رپورٹ کہہ رہے ہیں لیکن ہمارے ان کاغذات کے ساتھ انٹیلی جنس اور پولیس والوں کی تفتیشی رپورٹ منسلک ہے۔ ہم جھوٹ بولیں گے۔ وہ تو جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اگر ایک نہیں سب جھوٹ بولتے ہیں تو کیا آپ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے؟"

پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "جہاں تک بگڑنے کی بات ہے، ہم آپس میں بنالیں گے۔ کیوں نہ آپ ہمارے ساتھ شام کی چائے پئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

وہ ہنسنے لگی۔ شکار سامنے ہوتا تو مسکراہٹ سے کام چل جاتا۔ ٹیلیفون پر ہنسنا پڑتا ہے۔ سیٹھ سلطان چنے والا.......... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا، کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ادھر اس کی بیوی گنگنانے کے انداز میں بول رہی تھی۔ پہلے ٹی وی نہیں تھا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی آواز سُن کر ہی تصور میں دیکھنا پڑتا تھا کہ وہ آواز والی کتنی اداؤں بھری ہوگی۔ ٹیلیفون کے ذریعے اس کی آواز سُننے والا بھی تصورات کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہا ہوگا۔

وہ شام کو آیا۔ آئندہ بانو پردے کی پابند تھی۔ گھر سے باہر سیاہ برقعہ پہن کر جاتی

تھی۔ سیٹھ سلطان چنے والا کے دوست گھر آتے تو وہ ان کے سامنے نہیں آتی تھی، لیکن ایسے اہم افراد جن کے ساتھ کاروباری لین دین اور سمجھوتے بازی لازمی ہوتی تھی۔ ان کے سامنے چلی آتی تھی۔

وہ آفیسر پہلے تو ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور وہاں کے قیمتی سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اگرچہ وہ سیٹھ سلطان چنے والا سے زیادہ دولت مندوں کے ہاں بھی جایا کرتا تھا۔ وہاں اس سے بھی قیمتی سامان دیکھا کرتا تھا۔ خود اس کے ہاں سامان بہت کم تھا اور بیش قیمت سپنے زیادہ تھے اس لئے ہر گھر کے سامان کو انکم ٹیکس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

اگر کوئی بنتی سنورتی ہے تو دوسرے سے داد پانے کے لئے، کوئی خوشبو لگاتا ہے تو دوسروں کو مسحور کرنے کے لئے۔ کروڑ پتی، ارب پتی سرمایہ داروں کے ہاں بیرون ممالک سے امپورٹ کئے ہوئے آرائشی سامان اسی لئے ڈرائنگ روم میں سجائے جاتے ہیں کہ باہر کے لوگ اکثر ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ وہ دیکھیں، داد دیں اور خود ایسی چیزوں کی تمنا کریں۔ جب تک وہ تمنا نہیں کریں گے، رشوت لینے کی تحریک کیسے پیدا ہوگی؟

انکم ٹیکس کے آفیسر صاحب اس ڈرائنگ روم کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے لیکن سیٹھ سلطان چنے والا سے اُکھڑے ہوئے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ "دیکھئے، مسٹر سلطان! میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں۔ وہاں سے مجھے تمام سرمایہ داروں کی ہسٹری شیٹ معلوم ہوتی رہتی ہے۔ آپ کس طرح اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کالا دھندا کرتے ہیں اور کس طرح کالا دھن جمع کر رہے ہیں۔ ہمیں ساری باتوں کی خبر ہے۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "جناب! ہم تو غریب لوگ ہیں۔ کالا دھن وہ جمع کرتے ہیں جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہوتے ہیں۔"

"ہماری حاصل کردہ معلومات کے مطابق آپ ایک سال کے اندر کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ میں اور ہم میں کیا فرق ہے۔ آپ جہاں جہاں ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہیں۔ اپنے ذرائع بتاتے ہیں اور دولت کی کھچڑی پکاتے ہیں۔ ہم اس جگہ پہنچ کر کچن کے سپروائزر کی طرح ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں کہ کس کھچڑی میں کس قسم کا مصالحہ ڈالا گیا ہے۔ یہ دولت کی کھچڑی جتنی زیادہ پکتی ہے، جتنی زیادہ گردش میں رہتی ہے اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ آپ اسے کس طرح ذخیرہ کرتے ہیں، کس طرح حکومت کی آنکھ بچا کر اسے چھپاتے ہیں۔ اس کا ذرا ذرا سا حساب ہمیں معلوم ہے۔ ہوسکتا ہے ہماری یہ خوش فہمی ہو، بہت زیادہ حساب نہ رکھتے ہوں لیکن اس حد تک تو سمجھتے ہیں کہ خفیہ

تجوریوں میں کالا دھن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کہاں ہے وہ کالا دھن؟"

"کالا دھن؟" سیٹھ سلطان چنے والا نے سوالیہ انداز میں اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے آئندہ بانو داخل ہونے والی تھی۔ اسے معلوم تھا ابھی وہ بننے سنورنے میں مصروف ہے' اسی وقت ہلکی سی موسیقی سُنائی دی۔ ایئرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں میٹھی میٹھی خوشبو کا احساس ہوا۔ دولت چاہے تو دُنیا بدل دیتی ہے۔ وہ تو ڈرائنگ روم کا ایک مختصر سا ماحول تھا۔ ایک ملازمہ ایئرکنڈیشنڈ کے سامنے پرفیوم اسپرے کر کے چلی گئی تھی جس کے باعث ڈرائنگ روم کا پورا ماحول معطر معطر ہو رہا تھا........ صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے کالے دھن کا ذکر کرتے ہی چاروں طرف تازہ کرنسی نوٹوں کی خوشبو پھیل گئی ہو اور وہ دھن خوشبو بن کر اس کی خالی جیب میں پہنچنے ہی والا ہو۔

پھر وہ افسر بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر ایک پری تمثال نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک بڑا افسر تھا۔ اس کے سامنے ارب پتی سرمایہ دار کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک عورت کیا چیز تھی؟ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن بے اختیاری عمل میں آدمی کی اپنی مرضی شامل نہیں ہوتی' یا تو وہ کسی کی شخصیت سے' کسی کے رُتبے سے متاثر ہوتا ہے یا پھر بے پناہ حسن کی چکا چوند کو دیکھ کر یوں اٹھ جاتا ہے جیسے بیٹھے بیٹھے کم نظر آتا ہو۔ کھڑے ہونے سے کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملے گا۔ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کے ہر عمل دخل میں کچھ زیادہ پانے کی ہوس کہیں نمایاں ہوتی ہے' کہیں ڈھکی چھپی رہتی ہے۔ جہاں ڈھکی چھپی رہتی ہے وہاں آدمی کسی بے اختیاری لہجے میں آپ ہی آپ اٹھ کر اٹینشن ہو جاتا ہے جیسے کچھ پالینے کا وقت آ گیا ہو۔

آئندہ بانو سیاہ لباس میں تھی۔ ماحول کو ماتمی بنانے کا مقصد نہیں تھا۔ اسی لئے سیاہ لباس میں زری' گل بُوٹے جگمگا رہے تھے۔ ان گل بُوٹوں سے زیادہ اس کا حُسن گلہائے رنگا رنگ کی طرح دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ صاحب اسے یوں غور سے دیکھنے لگے جیسے ٹھیک سے نظر نہ آ رہا ہو۔ آنکھیں دُھندلا رہی ہوں یا عینک کا شیشہ بدلنے کی ضرورت پڑ گئی ہو۔ کسی کو بھی دیکھنے کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر وہ ایک باپ کی نظر سے دیکھتے تو آئندہ بیٹی نظر آتی........ بھائی کی نظر سے بہن اور بیٹے کی نظر سے ماں دکھائی دیتی' اگر وہی افسر صاحب سیٹھ سلطان چنے والے کی نظروں سے دیکھتے تو وہ بیوی سے زیادہ کالا دھن کا حساب بتانے والا کمپیوٹر مشین نظر آتی۔ اس لمحے صاحب اسے کالے لباس میں دیکھ کر سوچ رہے تھے۔ اگر کالے دھن کو ایک

جگہ ڈھیر کر دیا جائے اور اس کا حسین مجسمہ تراشا جائے تو وہ آئندہ بانو کا مجسمہ ہو گا۔ انہوں نے عینک کے شیشے کو اچھی طرح صاف کیا پھر اسے دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عینک کے شیشوں کا نمبر اتنی جلدی نہیں بدلتا جتنی جلدی انسان کی نیت کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔

آئندہ بانو ایک ادائے ناز سے چلتی ہوئی قریب آئی۔ پھر مسکرا کر بولی۔ "تشریف رکھیے۔"

وہ فوراً بیٹھ گیا۔ ملازمہ چائے اور ناشتے کی ٹرالی لے کر آئی۔ آئندہ بانو نے مٹھائی کی ایک ڈش اُٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "منہ میٹھا کیجئے۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "کس خوشی میں؟"

"اس خوشی میں کہ آپ ہمارے قریبی رشتے دار نکلے۔"

صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"مجھے بھی آج ہی پتا چلا۔ آپ کی وائف فہمیدہ میری رشتے کی بہن ہے۔"

"مگر کیسا رشتہ؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

"بات یہ ہے کہ جب ظہیرالدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے لشکر میں ایک بہت ہی دلیر سپاہی تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک پنجاب میں رہ گیا دوسرا سندھ آ گیا۔ بڑی کھوج لگانے کے بعد پتا چلا کہ فہمیدہ اس پنجاب والے سپاہی کے بیٹے کی نسل سے ہے اور میں اس بیٹے کی نسل سے ہوں جو سندھ چلا آیا تھا۔"

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تم نے اتنا گہرا تاریخی رشتہ کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟"

"آپ کو اس کا جواب فہمیدہ دے گی۔ آپ کے بائیں ہاتھ پر فون ہے۔ ابھی رابطہ قائم کر لیجئے۔"

اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کی آواز سنتے ہی پوچھا۔ "فہمیدہ! یہ کیا چکر ہے۔ کیا تم آئندہ بانو کو جانتی ہو؟"

دوسری طرف سے جواب ملا۔ "صرف جانتی نہیں پہچانتی بھی ہوں۔ آپ کو بھی پہچان لینا چاہئے۔ وہ دوپہر کو آئی تھی۔ بڑی ملنسار ہے۔ پچاس ہزار دے گئی ہے۔ اب ہمارے پاس تین لاکھ ہو چکے ہیں۔ میں کل ہی اسٹیٹ ایجنسی جاؤں گی اور ڈیفنس والی زمین خرید لوں گی۔"

صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ریسیور رکھ کر مسکراتے ہوئے آئندہ بانو کو دیکھا اور کہا۔ "ہمارا شجرہ ایک ہی ہے۔"

☆========☆========☆

اگر سیٹھ سلطان چنے والا ایک ڈیڑھ سال کی مدت میں دولت مند بن گیا تھا تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہماری قوم میں بڑے بڑے ہنرمند ہیں جو راتوں رات امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جب دولت آتی ہے تو جوانوں کو جوا بھاتا ہے۔ شراب لگتی ہے اور بوڑھوں کو شباب لگتا ہے۔ امیروں اور امیرزادوں کی اکثریت اپنے ظرف میں نہیں رہ سکتی۔ چھلکنے لگتی ہے۔

بڑی حیرانی کی بات یہ تھی کہ سیٹھ سلطان چنے والا کو نہ جوئے کی لت لگی نہ شراب کا چسکا پڑا۔ جہاں تک شباب کا تعلق تھا اس کی جوانی چنے کی طرح بے رنگ اور بھوسہ بھری تھی۔ گھوڑے کے منہ میں جانے کے لئے تھی۔ ایسے میں اچانک ہی اس کی کایا پلٹ گئی۔ آئندہ بانو نے حیرانی سے دیکھا۔ ایک روز وہ صبح اُٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر اس نے کہا۔ "یہ بڑی خوشی کی بات ہے تم نے نماز شروع کردی۔ اب اسے نہ چھوڑنا۔"

"ابھی میں نماز پڑھ رہا تھا تو عجیب طرح کا سکون مل رہا تھا۔ یُوں لگ رہا تھا میں ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ دن رات جھوٹ بولنے' فریب دینے' کالا دھندا کرنے' کالا دھن جمع کرنے کا جو ایک انجانا سا بوجھ' ہمارے دل پر' دماغ پر اور ضمیر پر ہوتا ہے۔ وہ نماز پڑھتے وقت نہیں تھا۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں پڑھتے رہا کرو۔ ایک طرح سے تسکین ملتی ہے کہ ہم جو گناہ یا جرم کررہے ہیں ساتھ ہی اس کی تلافی بھی کررہے ہیں۔ ہماری توبہ قبول ہو رہی ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ایک طرف گناہ کرتے جائیں۔ دوسری طرف نماز کے ذریعے اسے دھوتے بھی جائیں؟"

"ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ انسان کی زندگی میں نیکی اور بدی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جب ہم دس کماتے ہیں تو ایک خیرات بھی کرتے ہیں۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔ کسی بھی عالمِ دین سے پوچھیں گے تو وہ ہمارے خلاف فتویٰ دے گا۔"

"کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ایک صحیح کھاتہ لکھتے ہو۔ اس میں تمہاری

دولت کا صحیح حساب ہے۔ دوسرا فراڈ کھاتہ لکھتے ہو جس میں تم دیوالیہ نظر آتے ہو۔ کیا کسی عالمِ دین کے کہنے سے انکم ٹیکس والوں کو صحیح کھاتہ لے جاکر دکھادو گے؟"

وہ بے اختیار انکار میں سرہلانے لگا۔ اس نے آئندہ بانو کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ کوئی دولت کو ہاتھ سے بے ہاتھ ہونے نہیں دیتا۔ اس نے کہا۔ "آرام سے ناشتا کرو۔ کاروبار کے وقت کاروبار کرو۔ عبادت کے وقت عبادت۔"

وہ سمجھ گیا۔ آرام سے ناشتا کرنے لگا۔ آئندہ بانو نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ اب وہ اس کی ہر بات نہیں مانتا ہے کچھ دنوں سے اس کے اتنے خوبصورت اور مہنگے ڈرائنگ روم میں مولوی حضرات آنے لگے تھے۔ بعض اوقات صبح سے شام تک مذہب کے کسی مسئلے پر سیر حاصل گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ وہ گفتگو صرف ڈرائنگ روم تک محدود نہیں رہتی تھی۔ رات کو وہ بیڈ روم میں آتا تو آئندہ بانو کو سمجھاتا' یہ نیکی ہے' یہ بدی۔ یہ حلال ہے یہ حرام۔ اس لئے ہمیں یہ کرنا چاہئے وہ نہیں کرنا چاہئے۔

جواباً آئندہ بانو اسے اپنا سبق پڑھاتی تھی۔ ان دنوں سیٹھ سلطان چنے والا ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان اُلجھا ہوا تھا۔ باہر سے کچھ سیکھتا رہتا تھا' اندر سے وہ کچھ اور سکھا دیتی تھی۔

ایک دن اچانک ہی اس نے کہا۔ "میں تبلیغی جماعت کے ساتھ باہر جا رہا ہوں۔" اس نے آئندہ بانو کا جواب سُننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ اس سے کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہنے لگا تھا۔ کسی بات کے سلسلے میں مشورہ نہیں لیتا تھا جو اس کے دل میں آتا تھا اور جسے وہ صحیح سمجھتا تھا کر گزرتا تھا۔

رائے ونڈ کے بہت بڑے اجتماع میں جاکر اس کی آنکھ کُھلی کہ کفر کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ حلال کیا ہے؟ وہ واپسی پر تبلیغی جماعت کے ساتھ مختلف شہروں کا دورہ کرتا رہا۔ تقریباً چھ ہفتے بعد گھر واپس آیا۔ آئندہ بانو نے اسے شدید حیرانی سے دیکھا۔ وہ اپنے پُرانے حلئے کی طرف لوٹ آیا تھا۔ پہلے کی طرح میلے کپڑے اور پھٹا ہوا پاجامہ تو نہیں پہنا تھا لیکن پاجامہ پہننا پھر شروع کردیا تھا۔ وہ بھی شرعی پاجامہ تھا جس کے پائنچے تنگ تھے لیکن لباس اُجلا اور صاف ستھرا تھا۔ وہ ناگواری سے بولی۔ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے فخر ہے' میرا خمیر جس خاک سے اُٹھا ہے میں اسی کی طرف پہنچ رہا ہوں۔ اب مجھے خدا اور رسولؐ کے احکامات نظر آتے ہیں' تم نظر نہیں

آتیں۔ اپنا جھوٹا نظریہ آئندہ میرے دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہتر ہے میرا گھر چھوڑ کر چلی جاؤ۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"درست کہہ رہا ہوں۔ جب سے میرے گھر آئی ہو۔ میں نے جھوٹ، فریب، چوری، بے ایمانی اور دغا بازی سیکھ لی ہے۔ یہ جتنا دھن میں نے کمایا ہے حکومت کی نظروں سے اب تک چُھپا رکھا ہے، اب میں اسے ڈکلیئر کروں گا۔"

"چنے والے! کیا تمہارا ماتھا گھوم گیا ہے۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دُنیا میں صرف دو چیزیں چُھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ ایک عیب دوسری کوئی خوبصورت سی چیز۔ نہ تو بہت زیادہ بُرائی کو ظاہر کیا جاتا ہے نہ ہی بے انتہا حسن کو عام کرنا پسند کیا جاتا ہے۔ کیا تم مجھے برقعے سے باہر ڈکلیئر کرنا پسند کرو گے؟"

"جب میں تمہیں چھوڑ ہی دوں گا تو تمہارے حسن، تمہاری اہمیت، تمہاری قدر دوسروں کی نظروں میں ہوگی، میری نظروں میں نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ دنیا کو اور اپنے حسن کو دولت کے ذریعے حسین ترین بنانے کی کوشش ترک کردو۔ جو راستہ میں نے اپنایا ہے اسی پر میرا ساتھ دو۔"

وہ رات بحث میں گزر گئی۔ دوسری صبح وہ اپنے مالی مشیر کو بلانا چاہتا تھا اور اس کے ذریعے اپنی تمام چھپی ہوئی دولت کو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ آئندہ بانو نے پوچھا۔ "تم کیا سوچ کر ایسا کر رہے ہو؟"

"یہ سوچ کر کہ ایمان کی ایک سوکھی روٹی بے ایمانی کے تر نوالے سے بہتر ہے۔"

"سوکھا لقمہ یا تر نوالہ صرف آج زندہ رکھتا ہے۔ آئندہ زندہ رکھنے والی دولت ہوتی ہے۔ میں آئندہ ہوں اور آئندہ کی بات کرتی ہوں۔"

"میرا ایمان آج پر ہے۔ آج کی محنت آئندہ کام آتی ہے۔"

"جب تم آج پر ایمان رکھتے ہو تو میرے ساتھ تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا راستہ واقعی الگ ہو جانا چاہئے۔"

"میں اس باہمی اختلاف کی بنا پر طلاق دیتا ہوں۔ تم آئندہ کو مستحکم بنانے کے لئے ناجائز دولت کا ذخیرہ کرتی ہو۔ میں آج کو مستحکم بنانے کے لئے نیک اعمال کا ذخیرہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے متواتر تین طلاقیں دیں۔ آئندہ بانو نے اپنا سیاہ برقعہ اُٹھایا۔ پھر اسے پہنتے

ہوئے کہنے لگی۔ "ہماری دُنیا کی ہر ذی روح خواہ انسان ہو، حیوان ہو، چرند پرند ہوں یا کیڑے مکوڑے، یہ سب اپنی ایک مشترکہ فطرت رکھتے ہیں، ان سب کی فطرت چُھپانا ہے۔ وہ اپنی مختصر سی زندگی میں کچھ نہ کچھ ضرور چُھپاتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے آئندہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، موسم برسات سے پہلے ہی کہیں نہ کہیں اپنی خوراک کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ سانپ انڈے کھا لیتا ہے۔ اس لئے پرندے درخت کی اونچی اور گھنی شاخوں پر ایسی جگہ گھونسلہ بنا کر انڈوں کو چُھپاتے ہیں اور مادہ انہیں سیتی ہیں، جہاں سانپ نہیں پہنچ سکتے اور ان کے ننھے بچوں تک باز کی نظریں بھی نہیں پہنچتیں۔ بلی اپنے بچوں کو بلے کی نظروں سے چُھپاتی پھرتی ہے۔ ایک بچہ دوسرے بچوں سے کم از کم ایک ٹافی ضرور چھپاتا ہے۔ ایک جوان لڑکی دنیا والوں سے اپنے رنگین اور سنگین سپنے چھپاتی ہے۔ ایک بیوی اپنے میاں سے ماہانہ بچت کو چھپا کر رکھتی ہے۔ ایک میاں اپنی بیوی سے بیرونی مصروفیات چھپائے رکھتا ہے اور اپنی آئندہ نسل کے تحفظ کے لئے اپنی بڑھتی ہوئی آمدنی کو زیر زمین لے جاتا ہے۔ خدا سے کچھ نہیں چھپتا۔ یہ انسان کی خوش فہمی ہی سہی۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر خدا سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور چھپانا چاہتا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے تک گئی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔ "چنے والے! میں جا رہی ہوں۔ مگر ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ تم انسانی فطرت سے مجبور ہو کر آئندہ کبھی نہ کبھی خدا سے بھی چھپنا چاہو گے۔ میں اس وقت بہت یاد آؤں گی۔"

اس نے برقعے کو اِدھر اُدھر سے درست کیا۔ چہرے پر نقاب ڈالی۔ پھر اس کوٹھی سے نکل گئی۔

☆========☆========☆

بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں رہ رہ کر چمک رہی تھیں۔ وہ موسلا دھار بارش میں بھیگتی ہوئی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی۔ پھر وہاں سے ایک بیڈ روم میں آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیڈ روم میں ایک شخص بھرا ہوا گلاس اُٹھائے کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بارش کا دھندلایا ہوا منظر دیکھ رہا تھا۔ باہر تقریباً تاریکی تھی جب رہ رہ کر بجلی چمکتی تو دُور تک بھیگتا ہوا منظر دکھائی دیتا۔ پھر تاریکی میں گم ہو جاتا تھا۔

وہ آہٹ سُن کر پلٹ گیا۔ آنے والی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم نے دیر لگا دی۔"

"اور کیا کرتی۔ اتنے زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ میں انتظار کرتی رہی کہ ذرا تھمے

تو آؤں۔ آخر بھیگتے ہوئے ہی آنا پڑا۔"

اس شخص نے ایک گھونٹ بھر کے کہا۔ "وحیدہ! میں نے ملازموں کو چھٹی دے دی ہے۔ صرف غلام باقی اپنے کمرے میں ہے۔ کیا اس نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے؟"

وحیدہ نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بہت محتاط رہ کر آئی ہوں۔ غلام باقی کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

اس نے وحیدہ کی کلائی تھامنا چاہی......... وہ دُور ہٹتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ایک ہاتھ میں جام ہے اور دوسرے میں کلائی ہوگی تو ہم اپنے منصوبے پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ پہلے تم کاروبار پر قبضہ کرو گے پھر مجھ پر۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "اچھی بات ہے۔ جاؤ اور غلام باقی کو شیشے میں اُتار لو۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ راہداری کے دوسرے سرے پر غلام باقی کا بیڈ روم تھا۔ وہ اسی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑھنے لگی۔ اس وقت وہ تنہا تین افراد کے درمیان اُلجھی ہوئی اپنے منصوبے پر عمل کر رہی تھی۔

ان تین افراد میں سے پہلا شخص اس کا سوتیلا بھائی تھا۔ دوسرا اس کا وہ عاشق غلام حسین تھا' جس کے بیڈ روم سے نکل کر آئی تھی۔ تیسرا بھی اس کا عاشق ہی تھا۔ اس کا نام غلام باقی تھا......... وہ دونوں غلام حسین اور غلام باقی بھائی تھے۔ غلام حسین جانتا تھا کہ وحیدہ صرف اسے چاہتی ہے اور غلام باقی کو محض بیوقوف بنا رہی ہے۔ وہ تینوں افراد کرنسی کے دھندے میں لکھ پتی بنتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد کروڑ پتی بننے کا خواب تھا۔

یہ خواب اس شرط پر پُورا ہو سکتا تھا کہ موجودہ دھندے میں تین پارٹنر نہ ہوں۔ ایک آدمی ہوتا تو وہ کب کا کروڑ پتی بن چکا ہوتا۔ یہ خواب پورے کرنے کے لئے وحیدہ پیش پیش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سوتیلے بھائی کے کاروبار میں اسے حصہ نہیں ملے گا۔ بھائی زیادہ سے زیادہ اس کی شادی کرا دے گا۔ لاکھوں کا جہیز دے گا اور رخصت کر دے گا۔

یہی سوچ کر اس نے ایک طرف غلام حسین کو اور دوسری طرف غلام باقی کو بے وقوف بنانا شروع کیا۔ دونوں ہی طرف کامیاب ہوتی چلی گئی۔ فیصلہ یہ رہ گیا تھا کہ دو میں سے کون بہتر ہے؟

یہ بات وحیدہ کو غلام حسین نے ہی سمجھائی۔ "تم میری دلہن بن کر آجاؤ گی تو دولت

کے اسی حصے پر راج کرو گی جو پارٹنر کی حیثیت سے تیسرے حصے کی دولت ہوگی۔ اگر میں نے شادی سے انکار کیا تو تم غلام باقی سے شادی کرو گی۔ اگر اس نے بھی انکار کر دیا تب کہیں کی نہ رہو گی۔ تمہارا بھائی جانے کس کے پلّے تمہیں باندھ دے۔ اس کے بعد تمہاری آنکھوں سے دولت کے خواب ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔"

وحیدہ نے پوچھا۔ "تم مجھ سے شادی کرنے سے کیوں انکار کرو گے؟"

"میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو میری ہم مزاج ہو۔"

"مجھے آزما کر دیکھ لو۔"

"کیا تم اسے تسلیم کرتی ہو کہ ایسے چلتے ہوئے کاروبار کا صرف ایک مالک ہونا چاہئے۔ پارٹنر شپ نقصان پہنچاتی ہے اور حصہ داری میں مال کا صرف تیسرا حصہ ہمارے ہاتھ لگتا ہے۔"

"میں تسلیم کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سارے کا سارا مال ہمارے پاس آتا رہے۔"

"کیا یہ بھی تسلیم کرتی ہو کہ اس کے لئے دونوں پارٹنروں کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔"

"یہ راستے سے ہٹ جائیں تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"کوئی بڑھتے ہوئے منافع سے ہاتھ دھونا پسند نہیں کرتا۔ ایسے ہاتھ کاٹنے پڑتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم انہیں ختم کر دینا چاہتے ہو؟ ہمیشہ کے لئے؟"

"ہاں' اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ زندہ رہیں گے تو ساری زندگی ہم سے حصہ طلب کرتے رہیں گے۔"

یہ سازش دونوں کے درمیان پکتی رہی۔ وہ دونوں اس سلسلے میں بحث کرتے رہے اور کسی نتیجے پر پہنچتے رہے۔ پھر غلام حسین نے سمجھایا۔ "وحیدہ! جو پلاننگ تم میرے ساتھ کر رہی ہو۔ وہی غلام باقی سے مل کر کرو۔ اسے اس حد تک قائل کر لو کہ وہ اپنے پارٹنر کو ختم کرنے کے لئے پہلے تمہارے بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں سمجھ گئی۔ ایک مقتول ہوگا' دوسرا قاتل بن کر پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے گا۔"

"ہاں' ہم اس سلسلے میں بہت مستحکم منصوبہ بندی کریں گے۔ پہلے تم باقی کو آمادہ کرو۔"

وقت گزرتا رہا اور وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ بھی اپنی ہونے والی بیوی کے بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے راہداری کے آخری سرے پر آئی اور غلام باقی کے کمرے کے دروازے کے سامنے رُک گئی۔ غلام باقی آج ہی مشرقِ وسطیٰ سے آیا تھا۔ کرنسی کے دھندے میں یہی ہوتا تھا۔ وہ تینوں پارٹنر باری باری دو چار ماہ کے لئے مختلف ممالک میں جاتے تھے اور وہاں سے ہنڈی کا کاروبار کرتے تھے اور اس کے ذریعے لاکھوں کا زرِ مبادلہ کماتے تھے۔

وحیدہ نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک سے پہلے ہی دروازہ کُھل گیا۔ غلام باقی نے مسکرا کر اسے بڑی محبت سے دیکھا۔ پھر بولا۔ ”تم نے دیر لگا دی۔“

”میں کیا کرتی؟ بارش ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی ہے تمہارے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ دیکھ لو‘ کس طرح بھاگ کر آئی ہوں۔“

اس نے وحیدہ کو دیکھا۔ بلی بھیگتی ہے تو سکڑتی ہے......... عورت بھیگ کر گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھلتی چلی جاتی ہے‘ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”نہ‘ نہ‘ پہلے منصوبے پر عمل ہوگا۔ آج سے بہتر موقع اور نہیں ہوسکتا۔ زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ باہر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہماری کوٹھیوں کے آس پاس ویرانی ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔“

”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس بارش میں کوئی دیکھنے والا نہیں ہوگا؟“

”ہماری کوٹھی کچھ زیادہ دُور تو نہیں ہے۔ یہ پڑوس میں ہے۔ میں بارش میں بھیگتی آئی ہوں۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں دُور دُور تک نظریں دوڑاتی رہی۔ کبھی کبھی بجلی کے کوندنے سے کچھ نظر آتا تھا ورنہ گہری تاریکی چھا جاتی تھی۔ ایسے میں کوئی مجھے کیسے دیکھ سکتا تھا اور تمہیں بھی کیسے دیکھ سکے گا۔ تمہیں فوراً یہاں سے جانا چاہئے۔ بھائی جان اپنے بیڈ روم میں بیٹھے پینے میں مصروف ہیں۔ وہ نشے کی حالت میں مدافعت نہیں کرسکیں گے۔ تم بہ آسانی اپنا کام کرکے چلے آؤ گے۔ تمہارے پاس ریوالور ہے نا؟“

”میں احمق ضرور ہوں لیکن اتنا بھی نہیں۔ میں نے صبح یہاں پہنچنے کے بعد اپنے ریوالور کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”یہ تم نے اچھا کیا۔ اب اس ریوالور سے قتل کرو گے تو پولیس والے یہی رائے قائم کریں گے کہ تمہارا ریوالور جس نے بھی چُرایا تھا‘ اسی نے قتل کیا

ہے۔“

غلام باقی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے اتنے احمق نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی رائے قائم کرسکتے ہیں کہ میں نے خواہ مخواہ ریوالور گم ہونے کی رپورٹ درج کرائی اور اسی سے اپنے ایک پارٹنر کو راستے سے ہٹانے کے لئے قتل کردیا۔“

وحیدہ نے پوچھا۔ ”پھر کیسے قتل کرو گے؟“

”مجبوری ہے۔ چاقو سے حملہ کروں گا۔“

”ایسے تو گڑ بڑ ہو جائے گی۔ تم دونوں میں مقابلہ ہوگا۔ بھائی جان مدافعت کریں گے۔ ہو سکتا ہے تم ان پر غالب نہ آسکو۔“

وہ اپنا پرس کھول کر اپنا ریوالور نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”قتل پلک جھپکتے میں ہونا چاہئے......... کوئی مصیبت اپنے سر نہ لو۔“

”یہ کس کا ریوالور ہے؟“

”بھائی جان کا۔ تم قتل کرنے کے بعد اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا کر اسے وہیں پھینک آنا۔“

اس نے ریوالور کے چیمبر کو چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ وحیدہ نے کہا۔ ”میں جاتی ہوں۔ وقت کا خاص خیال رکھو۔ مجھے گھر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگیں گے۔ میں اپنی خوابگاہ میں جاکر نیند کی دو گولیاں کھاؤں گی۔ آدھے گھنٹے کے اندر نیند آجائے گی۔ تم یہاں سے ٹھیک چالیس منٹ کے بعد نکلنا۔ میں سونے سے پہلے اندرونی دروازے کھلے رکھوں گی۔“

وہ تمام باتیں سمجھا کر چلی گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ چالیس منٹ کے بعد یعنی ٹھیک بارہ بجے رات کو اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

انسان آج جو فیصلہ کرتا ہے ہمیشہ آئندہ کے لئے کرتا ہے۔ آج کی رات فیصلہ کن تھی۔ آج کے بعد وہ ایک حسین عورت کا مالک اور ایک بہت بڑے کاروبار کا دوسرا اور آخری پارٹنر بن کر رہنے والا تھا۔ وہ چاہتا تھا‘ صرف وہ اور اس کا بھائی غلام حسین کاروبار میں رہیں۔ تیسرا کوئی نہ ہو۔ آج اس کی یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

لیکن اس کے دل میں کچھ سوالات کھٹکتے رہتے تھے۔ ایک تو یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کیا وحیدہ محبت میں مخلص ہے؟ کیا واقعی اس سے محبت کرتی ہے؟ اس نے کئی بار اسے

اپنے بڑے بھائی غلام حسین کے ساتھ ہنستے بولتے اور بڑی حد تک بے تکلف ہوتے دیکھا تھا۔ پھر ایک سوال پیدا ہوتا تھا۔ کیا میرے بھائی جان بھی میری طرح کاروبار میں یہ سوچتے ہیں کہ صرف دو پارٹنر ہونے چاہئیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ صرف تنہا مالک و مختار بننے کے متعلق سوچتے ہوں؟

وحیدہ جب بھی غلام باقی کے پاس آتی تھی' یہی سمجھاتی تھی کہ دونوں پارٹنر کو ختم ہو جانا چاہئے۔ وہ صرف غلام باقی سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ یہی تاثر دیتی تھی کہ غلام حسین سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ایک انسان دوسرے انسان کو اس کی آخری کمینگی تک نہیں سمجھ سکتا۔ سمجھنے کے لئے بہت سی باتیں رہ جاتی ہیں۔ اسی لئے غلام باقی اُلجھ رہا تھا۔ کبھی وحیدہ پر شبہ کرتا تھا۔ کبھی اپنے بھائی پر لیکن وحیدہ کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو سارے شک و شبہات اس کے دل سے نکل جاتے تھے۔

وقت گزر رہا تھا۔ بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد آدھی رات کو وہاں سے نکلنے والا تھا۔ اس نے ریوالور کے چیمبر کو ایک بار پھر چیک کیا۔ اسے اپنی جیب میں رکھا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب بارہ بجنے میں صرف ایک منٹ رہ گیا تھا اور ایک منٹ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔ ''بس اب نکل ہی پڑے۔''

اس سوچ کے ساتھ ہی یک بیک زور سے بجلی کی کڑک سنائی دی۔ پھر ایک تیز روشنی کھڑکی کے ذریعے کمرے کی اندر آئی۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت پھر بجلی نے کڑک کر زوردار آواز پیدا کی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ خودبخود کُھل گیا۔

اس کے سامنے ایک حسین و جمیل عورت کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کالے برقعے میں تھی۔ اگرچہ پوری طرح نمایاں نہیں تھی لیکن چہرے سے نقاب اُلٹا ہوا تھا۔ سرِ ورق دیکھ کر ہی کتاب کے بھرپور حسن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ پری چہرہ بے پناہ بارش میں بھیگ کر آئی تھی اور اب وہ آہستہ آہستہ اپنا برقعہ جھٹک رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''آئندہ۔''

''آئندہ؟ کیا مطلب؟''

''مطلب صاف ہے۔ آج زندہ رہنے والوں کے لئے دو روٹیاں کافی ہیں۔ جن لوگوں کو اپنے آج پر بھرپور اعتماد ہوتا ہے' وہ اپنے اعتماد کے ذریعے آئندہ کل کو خوبصورت بناتے ہیں۔ جو آج پر اعتماد نہیں کرتے وہ آئندہ کل کے لئے آدھی رات کو اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح تم نکل رہے ہو۔ چونکہ تم میرے لئے جا رہے ہو اس لئے میں آگئی ہوں۔''

''اگر تم آئندہ ہو تو اب سے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟''

''مجھے سمجھنے کے لئے یہ اچھی طرح سمجھ لو۔ آج محنت کرنے والے آئندہ کل کو خود نہیں بلاتے۔ وہ ''کل'' خودبخود ان کی جھولی میں آتا ہے۔ جو آج نہیں کرتے اور چور دروازے سے آئندہ دنوں کو بلاتے ہیں' وہاں میں پہنچ جاتی ہوں۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں پہیلی نہیں ہوں۔ تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ غیب کی باتیں نہیں جانتی لیکن یہ ضرور بتاؤں گی کہ تمہارے متعلق بہت کچھ جانتی ہوں۔ کیا یہ درست نہیں کہ تم قتل کے ارادے سے باہر جانا چاہتے ہو؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم آخر کون ہو؟ کوئی جادوگرنی یا آسیب؟''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تمہیں کیا نظر آتی ہوں؟''

''میرا خیال ہے تم محض خیال ہو۔ میں آگے بڑھ کر تمہیں ہاتھ لگاؤں گا تو غائب ہو جاؤ گی۔ میرا ایک وہم ہو' مجھے یہ وہم روکنے آیا ہے کہ قتل کے ارادے سے نہیں جانا چاہئے۔ کچھ گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''ہاں' گڑبڑ تو بہت ہوگی۔ اگر میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو تمہارا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا ہو گا۔''

''اندر آؤ اور اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤ۔ تم میرے متعلق اور کیا کیا جانتی ہو؟''

وہ اندر آگئی۔ اس نے صوفے کی پشت پر بھیگے ہوئے برقعے کو پھیلا دیا۔ پھر ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں آج بارش میں بھٹک رہی تھی۔ سوچا' اس کوٹھی میں تھوڑی دیر پناہ لوں گی' پھر چلی جاؤں گی۔ جب میں کوٹھی کے اس حصے میں پہنچی جہاں تمہارے بڑے بھائی کا کمرہ ہے' تو کچھ آوازیں سنائی دیں۔ تمہارا بھائی وحیدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں بڑی دلچسپ تھیں' اس لئے میں چپ چاپ سننے لگی۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا وحیدہ بھائی جان کے کمرے میں گئی تھی؟''

"تمہارے پاس آنے سے پہلے بھی گئی تھی اور تمہارے پاس سے ہو کر بھی گئی ہے۔ تم جس منصوبے پر عمل کرنے جا رہے ہو وہ منصوبہ صرف وحیدہ کا نہیں' تمہارے بھائی جان کا بھی ہے۔ وہ دونوں چاہتے ہیں کہ وحیدہ کا بھائی تمہارے ہاتھوں قتل ہو اور تم قتل کے الزام میں پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں احمق نہیں ہوں۔"

"دنیا کے تمام احمق یہی کہتے ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "اے تم بہت بولتی ہو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"منہ توڑنے سے پہلے یہ سُن لو۔ وحیدہ تمہارے کمرے سے نکل کر تمہارے بھائی جان کے کمرے میں گئی تھی۔ اس نے بتا دیا ہے کہ تم نے ریوالور کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس طرح وحیدہ کا بھائی جب قتل کیا جائے گا تو وہ تمہارے ریوالور کی گولی سے قتل نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود تم پر الزام آئے گا۔ جانتے ہو کیسے؟"

وہ سوالیہ نظروں سے آئندہ بانو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "وحیدہ اور تمہارے بھائی جان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تم بہت ہی دانشمند قسم کے احمق اور اناڑی قاتل ہو۔ تم نے آج تک کوئی قتل نہیں کیا۔ پہلی بار کرنے جا رہے ہو' لہٰذا عادی مجرم کی طرح ہر پہلو پر غور نہیں کرسکتے۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ تم یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے جوتوں کے نشان مقتول کے کمرے تک بنتے جائیں گے۔"

"صرف جوتوں کے نشانات سے کیا ہوتا ہے؟"

"یقین کی حد تک شبہ ہو جاتا ہے۔ تم نے ریوالور کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرا کے دانشمندی نہیں کی ہے۔ جس رات اسے قتل ہونا ہے اس سے پہلے صبح کو تم نے یہ رپورٹ درج کرائی۔ اب یہ خیال قائم کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تم نے پولیس کو گمراہ کرنا چاہا۔ دوسری طرف مقتول کے ریوالور سے ہی اسے ہلاک کردیا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ پھر کہا۔ "اوہ مائی گاڈ' میں نے ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا تھا۔"

وہ گرتے گرتے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ پھر اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نہ آتیں تو میں بے موقت مرجاتا۔"

"اگر مرجاتے تو تمہاری زندگی کی کتاب سے آئندہ کا باب ختم ہو جاتا۔"

"میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"کب تک یاد رکھو گے؟"

"تم اتنی اچھی ہو کہ تمہاری یاد رکھنے کے لئے' ساری زندگی کے لئے اپنا سکتا ہوں۔"

"مجھے اپنا بنا کر رکھنا چاہتے ہو تو میرے مشوروں پر عمل کرو۔"

"ضرور عمل کروں گا۔"

"تمہارے دشمن چاہتے ہیں کہ تم قتل کرو لہٰذا ان کی یہ خواہش ضروری پوری کرنی چاہئے۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم بھی مجھے پھانسنا چاہتی ہو؟"

"نہیں' تمہارے ذریعے دشمنوں کو پھانسنا چاہتی ہوں۔ پھر ساری دولت' سارا کاروبار ہمارا ہوگا۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"جو کہہ رہی ہوں خاموشی سے اس پر عمل کرتے جاؤ۔"

"مشورے معقول ہوں گے تو میں عمل کرتا جاؤں گا۔"

"سب سے پہلے اپنے جُوتے اور جرابیں اتار دو۔"

اس نے عمل کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "اس قالین کو صاف کرو اس پر میرے اور وحیدہ کے قدموں کے نشان ہیں۔ ہمارے کیچڑ آلود سینڈل یہاں تک آئے ہیں۔"

مشورہ معقول تھا۔ اس نے اس پر بھی عمل کیا۔ پھر اس طرح فرش کی بھی صفائی کرتا ہوا، راہداری کے اس حصے تک گیا جہاں اس کے بھائی غلام حسین کے بیڈ روم کا دروازہ تھا۔

آئندہ بانو کے مشورے جاری تھے اور وہ عمل کرتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے بیڈ روم میں جھانک کر دیکھا۔ وہ نشے میں دُھت ہو چکا تھا۔ ایک ایزی چیئر پر آنکھیں بند کئے پڑا ہوا تھا۔ غلام باقی دبے قدموں اندر آیا۔ اس نے بھائی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی۔ پھر اس کے ذریعے الماری کو کھولا۔ اس کے ایک دراز سے ریوالور نکالا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ اسے بھائی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ آئندہ بانو شراب کی بوتل اس کے منہ میں ٹھونس رہی تھی اور تھوڑی بہت شراب اس کے حلق میں اُتار رہی تھی تاکہ وہ پوری طرح مدہوش رہے اور اپنے کمرے سے نہ نکل سکے۔

وہ آئندہ بانو کے مشورے کے مطابق ننگے پاؤں تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا جوڑا نکالا۔ پھر باتھ روم میں جاکر اسے پہن لیا۔ اپنا لباس بیڈ روم میں رکھ کر آگیا۔ اس کے بعد بھائی کے جوتے پہن لئے۔ وہ ذرا ڈھیلے تھے۔ اس نے کپڑوں کے ٹکڑے اندر ٹھونس دیے۔ جس کے بعد جوتا فٹ ہونے لگا۔

وہ آئندہ بانو کے معقول مشوروں پر عمل کرتا ہوا کوٹھی کے برآمدے تک آیا۔ اس نے کہا۔ ”میں انتظار کروں گی۔ تم جاؤ اور نہایت اطمینان سے اپنا کام کرکے آؤ۔ جیسا سمجھایا ہے وہی کرنا۔“

وہ چلا گیا۔ آئندہ بانو برآمدے کے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ عادی مجرم بھی اکثر خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ وحیدہ جب اس کوٹھی میں آئی تھی تو برآمدے سے لے کر غلام حسین کے بیڈ روم اور پھر غلام باقی کے بیڈ روم تک اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئی تھی۔ غلام باقی نے آئندہ بانو کے مشورے کے مطابق اس کے قدموں کے نشانوں کو اپنے بھائی کے کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ اب دیکھنے پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وحیدہ صرف اس کے بھائی غلام حسین کے کمرے تک گئی تھی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو اور دوسری چیزوں کو بھی ہاتھ لگایا ہو گا' جب کہ آئندہ بانو رومال پکڑ کر ہر چیز کو ہاتھ لگاتی گئی تھی اور غلام باقی نے دستانے پہن رکھے تھے۔

وحیدہ اور اس کا بھائی پاس والی کوٹھی میں ہی رہتے تھے' غلام باقی پندرہ منٹ میں ہی واپس آگیا۔ آئندہ بانو نے پوچھا۔ ”کیا کام ہو گیا؟“

وہ گھبرایا ہوا تھا۔ ہانپ رہا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آیا ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ”کام ہو گیا مگر گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔“

”زندگی میں پہلی بار ایک قتل کیا ہے۔ ایسا تو ہو گا ہی۔ تھوڑی سی برانڈی پی لو۔ ابھی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

وہ پہلے اپنے بھائی کے جوتوں سمیت اس کے بیڈ روم میں گیا۔ وہاں اس نے جوتے اتارے پھر اپنا لباس لے کر بھائی کے باتھ روم میں گیا۔ بھیگے ہوئے بھائی کے لباس کو باتھ روم میں ہی چھوڑ دیا۔ وہاں سے اپنا لباس بدل کر آئندہ بانو کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آیا۔ اس نے برانڈی کا ایک پیگ لیا۔ پھر کہنے لگا۔ ”کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔ وحیدہ نے اپنے وعدے کے مطابق دروازے کھلے رکھے تھے۔ میں نے اس کے بیڈ روم میں بھی جھانک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ یقیناً خواب آور گولیوں کا اثر تھا۔ بہرحال میں اس

کے بھائی کے کمرے میں پہنچا۔ وہ جاگ رہا تھا مگر مدہوشی کی حالت میں تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا لیکن پہچاننے کے لئے زندہ نہ رہا۔ میں نے جاتے ہی اسے گولی مار دی۔ تمہارے مشورے کے مطابق اس کے ٹیلیفون پر سے ریسیور اٹھا کر میز کے نیچے لٹکا دیا۔ ریسیور کے قریب ہی اس کی لاش کو ڈال دیا اور اس کے ہاتھوں میں ریسیور تھما دینے کے بعد پھر اسے الگ کردیا۔ اب یہ خیال قائم کیا جائے گا کہ اس نے دم توڑنے کے دوران ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دینی چاہی تھی۔“

آئندہ بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اور اس نے اطلاع دے دی۔ میں جا رہی ہوں۔ تم میرے آخری مشورے پر عمل کرنے کے بعد بستر پر لیٹ جاؤ گے۔“

”کیسے جاؤ گی؟ کیا تمہارے قدموں کے نشانات نہیں بنیں گے؟“

”میں نشانات مٹاتی جاؤں گی۔ میری فکر نہ کرو۔“

وہ جانے لگی۔ غلام باقی نے بڑی محبت' بڑی خوشامد سے کہا۔ ”مجھے دھوکا دے کر تو نہیں جا رہی ہو؟ واپس آؤ گی نا؟“

”آؤں گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آؤں گی۔“

آئندہ بانو مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ غلام باقی نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ایسی آواز نکالی جیسے شدید تکلیف میں مبتلا ہو' جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”پپ.......... پولیس اسٹیشن' مم..........میں اے نائین سے بول رہا ہوں۔ اُس نے مجھے گولی مم.......... مار دی ہے۔ وہ.......... وہ میرا پڑوسی۔ مم.......... میرا پا.......... پارٹنر غلام حسین ہے۔ مجھے قق قتل..........“

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ریسیور کو کریڈل سے ٹکرایا' پھر اسے نیچے چھوڑ دیا۔ جیسے قتل ہونے والے کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا ہو۔ اب اس ریسیور سے آواز آرہی تھی۔ ”ہیلو ہیلو میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ آگے بولو ہم نے کوٹھی کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ اپنا نام بتاؤ۔ ہیلو ہیلو۔“

دوسری طرف سے آواز آتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ یقیناً پولیس انسپکٹر نے ریسیور رکھ دیا ہو گا اور اب پولیس پارٹی کے ساتھ پڑوس والی کوٹھی میں پہنچنے ہی والا ہو گا۔

غلام باقی نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اپنے کمرے سے نکل کر اس نے بھائی کے کمرے میں جھانکتے ہوئے دیکھا تو وہ کچھ ہوش میں آرہا تھا۔ آئندہ بانو اس سے کہہ گئی تھی کہ جانے سے پہلے وہ اس کے حلق میں نیبو کا عرق ٹپکا جائے گی تاکہ اس کا نشہ ٹوٹ جائے اور وہ چند منٹوں کے بعد پولیس والوں سے گفتگو کرنے کے قابل ہو سکے۔

غلام باقی نے خوش ہو کر اطمینان کی سانس لی اور آئندہ بانو کو یاد کرتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آیا۔ اس نے دروازے کو اچھی طرح بند کیا۔ پھر اس کی ہدایت کے مطابق بستر پر آرام سے لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

جب اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تو اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اسے کہتے ہیں راتوں رات امیر ہونا۔ اب غلام باقی کی امارت کا دور شروع ہو رہا تھا۔ اگرچہ پولیس والوں نے اس کا بھی محاسبہ کیا تھا لیکن کیچڑ آلود جوتے اور پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے غلام حسین کے ثابت ہوئے تھے۔ اسی کے کمرے اور باتھ روم سے برآمد ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ پولیس دونوں بھائیوں کو لے گئی۔ غلام باقی چھوٹ کر آگیا اور غلام حسین تھانے سے حوالات، حوالات سے جیل، جیل سے عدالت اور......... عدالت سے پھانسی کے پھندے تک پہنچ گیا۔

اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچنے میں کافی عرصہ لگا۔ اس عرصے میں غلام باقی کے وارے نیارے ہوگئے۔ اسے دونوں پارٹنروں کی پوری دولت اور پورا کاروبار مل گیا۔ کیونکہ وہ کوئی......... قانونی کاروبار نہیں تھا۔ اس لئے کاروبار کا بلا شرکتِ غیرے مالک بننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک تو اتنی دولت اور اتنا کاروبار ہاتھ آیا۔ دوسرے آئندہ بانو جیسی ساتھی مل گئی۔ اس نے کئی بار آئندہ کا ہاتھ تھام کر شادی کی درخواست کی لیکن اس نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”میں تم سے تعاون کروں گی لیکن تمہاری شریکِ حیات نہیں بن سکتی۔“

”آخر مجبوری کیا ہے؟“

”میں ایک مشرقی عورت ہوں۔ دولت کے لئے خواہ کتنا ہی للچاؤں اور دولت حاصل کرنے کے لئے کتنے ہی فریب کروں۔ جھوٹ بولوں لیکن میری محبت، میری وفا صرف ایک مرد کے لئے ہے۔ اس مرد نے مجھے چھوڑ دیا۔ اب میں کسی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔“

ایک دن وحیدہ نے کہا۔ ”غلام باقی! میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ ہماری پلاننگ کی وجہ

سے تمہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔“

”تمہاری پلاننگ نے تو مجھے ڈبو ہی دیا تھا۔ اب تم ڈوب رہی ہو۔ ایک طرف تمہارا بھائی مرگیا۔ دوسری طرف تمہارا عاشق پھانسی پانے والوں کی کال کوٹھڑی میں ہے۔ تم گھر کی رہیں، نہ گھاٹ کی۔ تمہاری سزا یہی تھی۔ اگرچہ تم پر اپنے بھائی کے قتل میں شریک ہونے کا الزام عائد نہ ہو سکا تب بھی تم بے یارو مددگار رہ گئی ہو۔ ایک عورت کے لئے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے بھائی کی جان لے لے اور اسے کچھ حاصل نہ ہو، وہ ساری عمر بھٹکتی رہے۔ جاؤ کوئی اور بیوقوف تلاش کرو۔“

اس نے وحیدہ کو دھکے دے کر اپنی کوٹھی سے نکال دیا۔ اب وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ دولت تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے تین پارٹنر باری باری ملک سے باہر جاتے تھے اور ہنڈی کا کاروبار کرتے تھے۔ غلام باقی کو اب باقی دو پارٹنروں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان کی جگہ ملازم رکھ چکا تھا اور ان کی سختی سے نگرانی کرتا تھا۔

پاکستان سے جتنے لوگ مشرقِ وسطیٰ میں کام کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہاں سے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے لئے بڑی بڑی رقمیں بھیجتے ہیں۔ یہ رقمیں بنکوں کے ذریعے بھی آتی ہیں لیکن ہنڈی کا کاروبار کرنے والے بنکوں سے زیادہ تیز رفتاری دکھاتے ہیں۔ ان کی ضرورت کے مطابق جلد سے جلد وہ روپے ان کے عزیزوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بنک کے مقررہ ریٹ سے کچھ زیادہ رقم دیتے ہیں۔ اس طرح ملک سے باہر جو زرمبادلہ کماتے ہیں اس سے سونا خریدتے ہیں۔ پھر وہ سونا اسمگلنگ کے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے ملک میں لے آتے ہیں۔ اس طرح دوہرا منافع کماتے ہیں۔

غلام باقی نے ڈیفنس میں چار ہزار گز کے پلاٹ پر ایک محل نما شاندار کوٹھی بنالی تھی۔ اس کوٹھی کا ہر کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اس کے پاس چار ایئر کنڈیشنڈ قیمتی کاریں تھیں۔ اس نے چار برس میں تین شادیاں کی تھیں۔ چوتھی کی گنجائش رکھی تھی۔ اس کے لئے آئندہ بانو سے درخواست کرتا رہتا تھا اور وہ درخواست نامنظور ہوتی رہتی تھی۔

اس کے پاس ملکی اور غیر ملکی کرنسی کا اتنا ذخیرہ ہو گیا تھا کہ بیرونی ممالک سے آنے والے تمام جرائم پیشہ لوگ اس سے رابطہ قائم کرتے تھے اور ضرورت کے مطابق اس سے ملکی اور غیر ملکی کرنسی حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہ نوٹوں کو ایسے دیکھتا تھا جیسے کاغذ کے حقیر ٹکڑوں کو دیکھ رہا ہو۔

☆========☆========☆

دوسری طرف سیٹھ سلطان چنے والا اب وہ سیٹھ نہیں رہا تھا۔ وہ عالیشان کوٹھی سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلا آیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب اس نے اپنے کالے دھن کو حکومت کے سامنے ڈکلیئر کیا تو یہ اس کا نیک عمل تھا۔ حکومت نے اس کے اس اقدام کو بہت سراہا۔ اخبارات میں اس کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ اسے حکومت کی طرف سے تعریفی خط بھی ملا تھا۔ دیگر انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ نیک عمل سب کے لئے مستحسن ہوتا ہے لیکن کاروباری دنیا میں کاروباری لوگوں کے لئے نہیں ہوتا۔

مارشل لاء کے دور میں چوروں' بے ایمانوں پر اور زیادہ سختیاں کی جاتی ہیں۔ اس بار جو مارشل لاء آیا' وہ نفاذِ اسلام کا عزم لے کر آیا۔ لٰہذا کالا دھندا کرنے والوں اور ذخیرہ اندوزوں سے اور بھی زیادہ سختی سے نمٹا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے چوری' بے ایمانی اور ذخیرہ اندوزی' اسمگلنگ' چور بازاری وغیرہ بظاہر بند ہوگئیں۔ حکومت ہر سال بجٹ کی آمد پر سختی سے دھمکیاں دینے لگی کہ کالا دھن نکالو' چور بازاری' اسمگلنگ انکم ٹیکس کی چوری وغیرہ بند کرو۔ غیر قانونی ذرائع سے دولت حاصل کرنے والوں کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا لٰہذا جس کے پاس کالا دھن ہے ظاہر کردے' ظاہر کرنے والوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

چور ہونا اور بے ایمان ہونا گویا کہ معاشرے میں ایک لعنتی کردار ادا کرنا ہے جو لوگ یہ کردار ادا کرتے آرہے ہیں وہ بھلا خود کو کس طرح ظاہر کرسکتے ہیں کہ وہ چور اور بے ایمان رہ چکے ہیں۔

بار بار کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن اس دوران سلطان چنے والا کا دیوالیہ نکل گیا۔ حکومت نے یہ محاسبہ شروع کیا' کس کاروبار میں بہت زیادہ منافع حاصل کیا جاتا ہے اور ناجائز طریقے سے دولت کمائی جاتی ہے۔ محاسبے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ چنے کے کاروبار میں زیادہ منافع ہے۔ اگر منافع نہ ہوتا تو سلطان چنے والا کبھی اتنا کالا دھن ظاہر نہ کرتا جتنا کہ توقع بھی نہ کی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری طور پر چنے کا بھاؤ گرا دیا گیا۔ اس کا کاروبار کرنے والے تمام بیوپاری سیٹھ سلطان چنے والا کے دشمن بن گئے۔

جن کے دماغوں میں آئندہ کا خیال بسا ہو وہ منافع حاصل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیتے ہیں۔ غلہ منڈی کے بیوپاریوں کو جب یہ فکر لاحق ہوئی کہ آئندہ کیا ہوگا تو انہوں نے چنے کی دو کوالٹیاں بنا دیں۔ ایک اے کلاس فائن قسم کا چنا' دوسرا بی

کلاس کنکر تنکے اور بھوسہ ملا ہوا کرم خوردہ چنا' جسے شاید گھوڑے بھی کھانا پسند نہ کریں۔

یہ بی کلاس چنا سرکاری بھاؤ کے مطابق فروخت ہونے لگا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ چنے کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ روزے دار بی کلاس کا چنا استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ دکاندار چور دروازوں سے اے کلاس چنا منافع کے ساتھ مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ سلطان چنے والا نے بے ایمان بن کر رہنے والے دور میں اتنا منافع حاصل نہیں کیا تھا جتنا کہ اب دوسرے چنے کے بیوپاری کررہے تھے اور سلطان چنے والا کی یہ حالت تھی کہ وہ رمضان کے مہینے میں روزے داروں اور ایمان والوں سے نہ تو بے ایمانی کرسکتا تھا' نہ مہنگے داموں فروخت کرسکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ اس نے سالانہ آمدنی کا گوشوارہ پیش کیا تو وہ انکم ٹیکس والوں کے لئے ناقابلِ قبول تھا۔ جو شخص بے تحاشا منافع حاصل کرتا رہا ہو اور جس نے بے شمار کالا دھن جمع کیا ہو وہ بھلا ایک سال کی مختصر مدت میں دیوالیہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس پر اندھا دھند ٹیکس عائد کیا گیا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اس کی کوٹھی نیلام کردی گئی۔

ایمان کا راستہ بڑا کٹھن' بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ کانٹوں بھرے راستے سے گزر کر ایمان کامل تک پہنچنا پڑتا ہے۔ سیٹھ سلطان چنے والا جو اب سیٹھ نہیں رہا تھا۔ ابتدا ہی سے ارادے کا کمزور تھا۔ ہمیشہ اپنے راستے بدلتا تھا۔ وہ اب سوچتا تھا' کیا ایمان کے راستے پر ثابت قدم رہ سکے گا؟ کیا اس نے آئندہ بانو کو چھوڑ کر زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے؟

آدمی کبھی انسان بن کر اور کبھی شیطان بن کر سوچتا ہے۔ وہ نماز پڑھتے وقت توبہ کرتا تھا اور ایمان کے راستے پر ثابت قدم رہنے کا مصمم ارادہ کرتا تھا۔ ارادے کی پختگی کے لئے اب وہ چنے کا کاروبار چھوڑ کر نئے سرے سے کوئی نیا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔

کوئی سا بھی کاروبار کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ رقم بچانے سے بچتی ہے۔ اس کے پاس زیادہ رقم کبھی بچنا چاہتی تو وہ اسے نیک کاموں میں صرف کردیتا تھا۔ وہ آج پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس نے آئندہ کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

نئے کاروبار کے لئے اس نے بنک سے قرضہ لینے کی جدوجہد شروع کی۔ وہاں سے جواب ملا۔ ضمانت کے طور پر اپنی جائیداد گروی رکھنی ہوگی تب قرضہ ملے گا لیکن جائیداد کہاں تھی۔ آخری کوٹھی بھی نیلام ہو چکی تھی۔

وہ ناکام ہو کر بنک سے باہر آیا۔ اچانک ہی آئندہ بانو سے سامنا ہوگیا۔ اگرچہ وہ سیاہ

برقعے میں تھی۔ چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود سلطان چنے والا نے پہچان لیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آئندہ! یہ تم ہو؟"

"تم آئندہ کو نہیں مانتے تھے۔ پھر یہ لفظ' یہ نام زبان پر کیوں لا رہے ہو؟"

"میں کبھی پچھتاتا ہوں کہ تمہیں کیوں چھوڑ دیا۔ کبھی توبہ کرتا ہوں کہ اچھا ہوا چھوڑ دیا۔ ایمان تو ہاتھ میں ہے۔"

"دیکھو سلطان! میں ایمان کی دشمن نہیں ہوں۔ اگر دشمن ہوتی تو مزدوروں' کسانوں اور ایمانداری سے محنت کرنے والے محنت کشوں کو بہکانے کے لئے ان کے گھروں میں ضرور پہنچتی چونکہ انہوں نے محنت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ اس لئے میں ان کے پاس نہیں جاتی۔ کیونکہ ان کا آئندہ ایک جیسا ہے۔"

"ہاں مانتا ہوں۔ تمام غریبوں کا مستقبل ایک جیسا ہے۔"

"ماننا پڑے گا۔ وہ بے چارے کبھی آئندہ کے لئے پریشان نہیں ہوتے۔ جو پریشان ہوتے ہیں۔ وہ دولت اور ایمان کے درمیان چکراتے رہتے ہیں۔ ایمان کو پکڑے رہنا چاہتے ہیں اور دولت کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ ایسے لوگ اپنے کاروبار کا' اپنے نیک اعمال کا اور اپنے مزاج کا تعین نہیں کر سکتے کہ وہ ایمان دار رہیں گے یا دولت مند' میں ایسے ہی لوگوں کے پاس جاتی ہوں۔ جب تمہارے پاس کچھ نہیں تھا تو میں دولت لے کر آئی۔ جب تم نے ایمان کی خاطر دولت کو ٹھکرانا چاہا تو میں نے انکار نہیں کیا۔ تمہیں ایمان کے راستے پر چلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ مگر دیکھو آج تم پھر میرے راستے پر لوٹ آئے ہو۔ ہو سکے تو مجھ سے کترا کر نکل جاؤ۔"

"آئندہ بانو! کوئی ایسا مشورہ دو کہ میرا ایمان بھی سلامت رہے اور مجھے کچھ دولت بھی حاصل ہو جائے۔"

"دنیا کا کوئی دولت مند ایسا نہیں ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو اور جس نے کبھی بے ایمانی نہ کی ہو' بے ایمانی کے بغیر بے تحاشہ دولت جمع ہو ہی نہیں سکتی۔ جب بھی جمع ہوگی وہ غیر قانونی ہوگی۔ کاروبار کی دنیا ایک میدانِ جنگ ہے۔ جہاں لوگ ہتھیاروں سے نہیں' اپنی کاروباری چالبازیوں سے میدان جیت لیتے ہیں۔ جو چالبازیوں میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ وہ اس میدانِ جنگ میں یا تو مرجاتا ہے' یا خودکشی کرلیتا ہے یا وہاں سے بھاگ کر آتا ہے اور توبہ توبہ کرتے ہوئے خدا کے حضور جھک جاتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں' آدمی خود غرض ہوتا ہے۔ وہ دو طرح کی ناکامیوں کے بعد خدا کے آگے جھکتا ہے۔ ایک ناکامی اس

وقت جب جوانی کا زور ٹوٹتا ہے اور وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دوسری ناکامی اس وقت جب وہ کاروبار میں دیوالیہ ہو جاتا ہے لیکن یہاں معاملہ کچھ برعکس ہے۔ تم دیوالیہ ہونے کے بعد جوانی کی طرف لوٹ رہے ہو۔ میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے ہو۔"

"کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے؟"

"ہرگز نہیں' میری زندگی میں اب کوئی دوسرا شوہر نہیں آئے گا۔"

"اس کا مطلب ہے' تمہارے دل کے کسی گوشے میں اب بھی میری محبت باقی ہے۔ کیا ہم ایک نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں پھر سے اپنانا چاہتا ہوں۔"

"طلاق کے بعد میں تمہارے لئے حرام ہو چکی ہوں۔ آئندہ ایسی باتیں نہ کرنا۔"

"عجیب بات ہے۔ تم حرام کی دولت جمع کرنے کی ترغیب دیتی ہو۔ میں اپنے ساتھ رہنے کے لئے کہتا ہوں تو حرام اور حلال کا مسئلہ پیش کرتی ہو۔"

"انسان پورا کا پورا حرام خور نہیں ہوتا۔ اس کی حلال خوری اس کے اپنے نظریے اور اپنے مذہب کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً ہم مسلمانوں کے لئے خنزیر حرام ہے لیکن عیسائیوں کے لئے حلال ہے۔ میں تم سے کہوں کہ جان دے دو۔ تم کہو گے خودکشی حرام ہے۔ میں کہتی ہوں ایک عزت دار عورت کے لئے خودکشی ایسے وقت حرام نہیں ہے جب اس کی عزت جا رہی ہو۔ میں تمہاری دولت کے ساتھ کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ مگر اپنی عزت سے ہاتھ دھو کر نہیں جا سکتی۔"

"آئندہ بانو! جو شے حرام ہے۔ وہ حلال بھی ہو سکتی ہے۔"

"مذہب کے قوانین غلطیاں کرنے والوں کے لئے بڑے سخت ہیں تاکہ ساری عمر ان سے عبرت حاصل ہوتی رہے۔ مرد اپنی مطلقہ عورت سے دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اس عورت کو کسی دُوسرے شخص کے نکاح میں آنا پڑتا ہے اور یہ جبر کا سودا نہیں ہوتا۔ راضی خوشی نکاح کرنا پڑتا ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے اس شخص پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا کہ وہ اسے طلاق دے اور پھر طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں آ سکے۔"

"جب ہم اپنا کام نکالنے کے لئے رشوت کا دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ تو کیا دوسرے مرد سے طلاق حاصل کرنے کے لئے اسے بڑے بڑے نوٹوں کی ہوا نہیں دے سکتے۔"

"پھر تو وہ اسلامی قانون نہ ہوا۔ وہ دنیا کا سب سے کمینہ انسان ہے جو مذہب کا سائن بورڈ لگا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے اگر ہم اسلام میں حلالہ کے قانون کو نظرانداز کر دیں۔ میں

خواہ مخواہ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے کسی سے نکاح پڑھاؤں اور اس سے جبراً طلاق لے لوں تو بات کیا ہوئی' یہی نا کہ میں دوسرے مرد کے پاس بھی جا سکتی ہوں جبکہ کوئی بھی باحیا اور عزت دار عورت حلالہ کے قانون کے مطابق بھی کسی دوسرے مرد کو گوارا نہیں کرے گی۔"

"آئندہ بانو! اتنی اہم باتیں سرِ راہ مناسب نہیں ہیں۔ چلو ہم کسی بڑے ریستوران میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں۔"

"کسی کو قائل کرنے کے لئے بڑے ریستوران اور کلبوں میں لے جانا پڑتا ہے۔ تم نے انکم ٹیکس والوں کو رشوت دے کر اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن کسی آفیسر نے کسی ریستوران میں تمہاری دعوت قبول نہیں کی۔ تمہاری آخری جائیداد میں سے وہ کوٹھی بھی نیلام ہوگئی پھر تم نے نئے کاروبار کے لئے اخبارات میں پارٹنر شپ کا اشتہار دیا۔ اس کے باوجود تم کوئی مرغا نہیں پھانس سکے۔ پھر بنک سے قرضہ دینے والے افسران کی طرف رجوع کیا۔ انہیں بھی بڑی بڑی پارٹیاں دیں مگر کوئی تمہاری کسی پارٹی میں نہیں آیا۔ بنک سے قرضہ لینے کی آخری امید بھی دم توڑ چکی ہے۔ صرف میں آخری سہارا نظر آرہی ہوں مجھے ریستوران میں لے جانا چاہتے ہو۔ افسوس' میں کسی نامحرم کے ساتھ کہیں بھی نہیں جا سکتی۔"

وہ منہ پھیر کر ادھر گئی جدھر قیمتی ایئر کنڈیشنڈ کار کھڑی ہوئی تھی۔ ملازم نے اس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ چنے ولا اسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ تین لاکھ روپے کی گاڑی میں گھومتا تھا۔ آج آئندہ بانو بارہ لاکھ روپے کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ جھنجلاتا ہوا بنک کے اندر گیا۔ آفیسر نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "پھر کیوں آئے ہو؟"

"میں ایک ضروری ٹیلیفون کرنا چاہتا ہوں۔"

"سوری' یہ سرکاری ٹیلیفون ہے۔ بنک سے متعلقہ افراد ہی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔"

اس نے غصے سے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں۔ جب بڑے بڑے سرمایہ دار یہاں آتے ہیں۔ تب یہ پابندی نہیں ہوتی۔"

"تم خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

وہ وہاں سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک بڑی سی دکان میں پہنچا۔ دکان دار نے

اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آؤ چنے والا' کیا حال ہیں؟"

"میں ٹیلیفون کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور کرو۔ سنا ہے تمہارا ٹیلیفون کٹ گیا ہے۔"

"ہاں' کٹ گیا ہے۔ ایک وقت تھا جب میں متعلقہ افسران کو مٹھائی کھانے کے لئے ہر ماہ پانچ ہزار روپے دیتا تھا۔ روزانہ درجنوں ٹرنک کال کرتا تھا۔ محکمہ سے کبھی یہ شکایت نہیں آئی کہ میرا بل بیس ہزار اور پچیس ہزار کا ہے اور میں اسے ادا نہیں کرتا ہوں۔ اب یہ حال ہوگیا ہے کہ صرف دو سو روپے ادا نہ کرسکنے کی صورت میں فون کاٹ دیا گیا۔"

چنے والا نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "اب تو بجلی والے بھی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اگر بجلی کی لائن کٹ گئی تو میں ہمیشہ تاریکی میں رہوں گا۔ اس سے پہلے ہی میں اپنے گھر کو روشن کرنے کے انتظامات کرلوں' یہی دانشمندی ہے۔"

رابطہ قائم ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "میں سیٹھ سلطان چنے والا بول رہا ہوں اور غلام باقی سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد غلام باقی کی آواز سنائی دی۔ "فرمایئے سیٹھ سلطان چنے والا! میری یاد کیسے آگئی۔"

"میں نے تمہیں یہ سمجھانے کے لئے فون کیا ہے کہ میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔"

"کیا تم پھر پیچھے پڑ رہے ہو۔ ویسے اب وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو کیا ہوا' کوئی اس کا شوہر بھی نہیں ہے اور تم بھی اس کے کوئی نہیں لگتے۔ یاد رکھو' اسلامی نظام نافذ ہو رہا ہے۔ اسلامی قوانین پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے اگر تم ایک نامحرم عورت کے ساتھ رہو گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ نہ تو میں اس کے ساتھ رہتا ہوں اور نہ ہی وہ کوئی سستی اور بے حیا عورت ہے۔ تم نے شوہر کی حیثیت سے اس کی قدر نہیں کی اور چاہتے ہو ہم دوست کی حیثیت سے بھی اس کی قدر نہ کریں۔"

"کیسی دوستی' کہاں کی دوستی۔ ہمارے مذہب میں عورت سے دوستی جائز نہیں ہے۔"

"کاروباری تعلقات تو جائز ہیں۔ ہمارے ہاں کتنی ہی عورتیں لیگل پارٹنر ہیں۔ ایک طرح سے وہ میری ایڈوائزر بھی ہے اور میں اس کے مشوروں اور تجاویز سے فائدہ اٹھاتا ہوں میرا مشورہ ہے' تم پھر آئندہ بانو کے مشوروں سے فائدہ اٹھاؤ۔"

"مجھے اس کے مشوروں سے زیادہ اس کی ذات سے محبت ہے۔ میں اسے طلاق دے کر پچھتا رہا ہوں۔ پھر اس سے شادی کروں گا اور ایک دن ضرور کروں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ غصے سے سوچنے لگا کس طرح غلام باقی کو آئندہ بانو کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔ کوئی ایسی تدبیر کرے کہ اس کے کالے دھن کا سراغ مل جائے اور وہ مخبری کرکے قانون کی ننگی تلوار اس کے سر پر لٹکا دے۔

وہ ایسا سوچ سکتا تھا مگر کر نہیں سکتا تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ حکومت خود بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے لیکن وہ آج تک ایسا نہیں کرسکی۔ ویسے یہ خبر گرم تھی کہ آئندہ بجٹ میں کالے دھن کے سلسلے میں کوئی اہم فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

ایک بہت بڑے ہال میں اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں ملک کے بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ ان میں آئندہ بانو بھی تھی۔ ان کے درمیان یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ اس ملک میں ان کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ وہ اپنا سرمایہ صنعتی ترقی کے نام پر ضائع نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اسمگلنگ، چور بازاری، منشیات فروشی اور امپورٹ ایکسپورٹ کے غیر قانونی ہتھکنڈوں کے ذریعے اس قدر دولت حاصل ہوتی ہے کہ قانونی طور پر صنعتی ذرائع سے اتنی دولت حاصل کرنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ایک شخص نے کہا۔ "اصل وجہ یہ ہے کہ جائز کاروبار میں بھی ہمیں پولیس، انٹیلی جنس، کسٹم اور دیگر متعلقہ افسران کو رشوت دینی پڑتی ہے اگر اسی رشوت سے ناجائز ذرائع اختیار کئے جائیں تو زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ ہر شخص آئندہ زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتا ہے۔ آئندہ زیادہ سے زیادہ اپنا اور اپنی آئندہ نسل کا تحفظ چاہتا ہے۔ یہ تحفظ ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اسی لئے ہم اپنی دولت بیرونی ممالک منتقل کردیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اپنے ملک میں بھی کچھ چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ہم اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ اس ملک میں ہم نے جتنی دولت چھپا کر رکھی ہے۔ اسے کس طرح حکومت کی دسترس سے بچایا جائے؟"

آئندہ بانو نے کہا۔ "اس کا جواب یہی ہے کہ حکومت کو اس کا صحیح اندازہ کبھی نہ ہو کہ ملک میں کس قدر کالا دھن ہے۔"

سب خاموش ہو گئے تھے اور سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "جب حکومت کے پاس ہماری ناجائز دولت کا حساب نہیں ہوگا تو ہمارے ناجائز کاروبار کا بھی اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ پولیس، انٹیلی جنس، کسٹمز وغیرہ ہمارے ساتھ ہیں۔

ہماری آمدنی کا ایک حصہ ان کے پاس جاتا ہے۔ میں مشورہ دوں گی کہ آئندہ یہ افسران ہمارا سختی سے محاسبہ کریں اور ہمارے ناجائز کاروبار میں ملوث رہنے والے افراد کو اور اس مال کو بھی پکڑتے رہیں جن کے ذریعے ان اعلیٰ افسران کی کارکردگی ثابت ہوتی رہے۔"

ایک بڑے سرمایہ دار نے پوچھا۔ "آئندہ بانو! یہ تم بے تکا مشورہ دے رہی ہو۔ کیا ہم اپنا مال پکڑوا دیا کریں۔ ہمارے آدمی بھی گرفتار ہو جایا کریں؟ یہ تو سراسر گھاٹے کا سودا ہو گا۔"

آئندہ بانو نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ روزانہ اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوں گی کہ ناجائز کاروبار سے تعلق رکھنے والا مال پکڑا جا رہا ہے لیکن یہ مال اتنی ہی مقدار میں پکڑا جاتا رہے گا جتنا کھاتے وقت دسترخوان پر جھوٹا گرتا ہے۔"

سب نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "آپ تنہا نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ حکومت کے بااثر افراد ہیں۔ لہٰذا آپ میں سے کوئی بھی بڑا بیوپاری نہیں۔ صرف آپ کے کارندے پکڑے جائیں گے۔ آپ پس پردہ رہ کر ان کی رہائی کا سامان کرتے رہیں گے۔"

ایک موٹے نے خوش ہو کر کہا۔ "واہ اسے کہتے ہیں آئندہ کا پروگرام۔ ہم آج ہی سے اس پروگرام پر عمل کریں گے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔"

آئندہ بانو نے کہا۔ "جس ملک کے سرمایہ دار اپنی حکومت کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ ایک خوش فہمی تو یہ ہوئی کہ ناجائز کاروبار کا سختی سے محاسبہ کیا جا رہا ہے۔ اخبارات اس کی گواہی دیتے رہیں گے اور پولیس والے ناجائز کاروبار کا مال اور اس کے کارندے پکڑتے رہیں گے۔ اب رہی انتشار کی بات۔ حکومت کو ہماری طرف متوجہ رہنے کا موقع نہ دو۔ اس کی توجہ مختلف حصوں میں تقسیم کر دو۔ ہم ملک میں جتنی سماجی اور سیاسی اور اقتصادی بے چینی پیدا کریں گے اتنا ہی کامیاب رہیں گے۔

اس کے لئے محنت کش طبقوں میں ہمارا یہ اصول کار فرما رہنا چاہئے کہ یہ مزدور، کسان اور دوسرے ہنرمند اپنے مطالبات کم کریں مگر چیخ و پکار زیادہ کریں۔ اس مقصد کے لئے منشیات کی فراہمی کا ذریعہ اتنا آسان بنا دو کہ یہ نشہ کریں اور وقتی طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جائیں کہ انہوں نے سکون حاصل کرلیا ہے۔ جب نشہ ٹوٹے تو ان کی بے چینی اور بڑھ جائے۔

سیاسی اور سماجی طور پر طالب علم زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ طلبا میں صرف منشیات عام

کرنے سے بات نہیں بنتی۔ یہ اگرچہ ذہین ہوتے ہیں مگر جوشیلے اور جذباتی ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ہاتھ میں ایک چاقو ہو تو ان کی جوانی میں ابال آتا ہے۔ اگر ریوالور اور اسٹین گن مل جائے تو یہ چھلک پڑتے ہیں۔ لہٰذا ہتھیاروں کے حصول کو اتنا آسان بنا دیا جائے کہ یہ طلبا تک نہایت آسانی سے سستے داموں پہنچ جائیں۔ ہمیشہ بنیادی باتوں کو یاد رکھو۔ کالے دھن یا ناجائز دولت کا تحفظ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس ناجائز دولت کے ذریعے ملک میں تخریبی سرگرمیاں جاری رکھی جائیں۔ حکومت کو بلیک میل کیا جائے اور اعلیٰ افسران سے لے کر ملک کے بااثر افراد تک کو اپنی دولت کی مٹھی میں جکڑ لیا جائے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی سلطان چنے والا کی بلند آواز سنائی دی۔ سب نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوا اپنے سینے کو ٹھونکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں آئندہ کا مالک ہوں۔ یہ صرف میری ہے۔ میں اس کا ہوں۔ اس پر صرف میرا‘ صرف میرا حق ہے۔“

کسی نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ کون پاگل کا بچہ ہے۔“

کسی نے کہا۔ ”اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔“

جو دھکا دینے آیا۔ وہ مار کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ چنے والا اگرچہ کوئی رومانٹک ہیرو نہیں تھا۔ محبت کے معاملے میں بھی اناڑی تھا لیکن آئندہ بانو اسے تسلیم کرتی تھی کہ وہ چنے چباتے چباتے جسمانی طور پر گینڈے کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ اس نے کبھی اسے لڑتے نہیں دیکھا تھا لیکن اندازہ کیا تھا کہ ایسے وقت وہ دو چار پر بھاری پڑ سکتا ہے۔ اس وقت اس مجمع میں وہ بھاری پڑ رہا تھا۔ آئندہ بانو پر اپنا حق جتاتا ہوا‘ دھکے دیتا ہوا‘ بھیڑ کو چیرتا ہوا۔ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ فوراً چہرے پر نقاب ڈال کر وہاں سے پلٹ گئی دوسرے دروازے سے باہر جانے لگی۔

اس نے چیخ کر آواز دی۔ ”رک جاؤ‘ آئندہ ‘رک جاؤ۔“

وہ باہر پارکنگ ایریا میں آئی۔ ایک پولیس آفیسر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ واقعی تم آئندہ ہو۔ برقعہ پہننے کے باوجود کھلی ہوئی کتاب ہو۔ تم میری آئندہ ہو۔ تمہارے لئے تو میں جان بھی دے سکتا ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چنے والا میرا پیچھا کر رہا ہے مجھے یہاں سے لے چلو۔“

اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی

اور اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے گاڑی دوڑاتا چلا گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہنستے ہوئے بولا۔

”اب وہ کمبخت ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آخر وہ کون تھا؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میرا چاہنے والا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اس دنیا میں ایسا کون ہے جو تمہیں نہ چاہتا ہو؟“

”ہاں‘ مگر وہ منفرد ہے۔ میں بھی اسے چاہتی ہوں۔“

”تعجب ہے‘ پھر اس سے دور کیوں بھاگ رہی ہو؟“

”اس کی حماقت نے مجھے اس سے الگ کیا۔ اب میں دور ہوتی جا رہی ہوں۔“

”یہ بات میرے حق میں ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟“

”کیا تمہاری بیوی تمہیں نہیں چاہتی؟“

”وہ تو چاہتی ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔“

”کیا بچے بھی ہیں؟“

”ہاں‘ چھ عدد ہیں۔“

”پھر تالی ایک ہاتھ سے کیسے بجی؟“

”وہ اصل بات یہ ہے کہ میں مجبور تھا۔ مگر تمہاری خاطر کسی مجبوری کو خاطر میں نہیں لاؤں گا۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”چلو شادی نہ کرو۔ میری مہمان بن کر تو رہ سکتی ہو۔“

وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ سلطان چنے والا نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنی غلطی کی تلافی ضرور کرے گا۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرے گا۔ حاصل نہ ہو تب بھی اس کے پیچھے ساری عمر بھاگتا رہے گا۔ خواہ بھاگتے بھاگتے زمین ختم ہو جائے۔ آئندہ بانو زمین کے آخری سرے پر پہنچ کر بھی ہار نہیں مانے گی۔ اسے اپنانے سے انکار کرے گی اور سمندر میں چھلانگ لگانا پسند کرے گی تو وہ بھی اس کے ساتھ ڈوب مرے گا۔

پولیس آفیسر نے شام کو وردی پہن کر اپنے ہولسٹر میں ریوالور رکھتے ہوئے کہا۔ ”گیارہ بجے رات کو ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ تم جاگتی رہنا۔ میں تمہارے لئے ہوٹل سے بہترین کھانے لے کر آؤں گا۔“

اس کی بیوی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”پہلے مجھ سے کچھ کھا لو۔ پھر کسی اور کو کھلانا۔“

وہ افسر تھا مگر بیوی کو دیکھتے ہی مجرم کی طرح سکڑ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ”تم اچانک کیسے آگئیں۔ تم تو میکے چلی گئی تھیں۔“

”ہاں گئی تھی۔ اب آگئی۔ بھلا ہو اس چنے والے کا۔ وہ مجھے لے کر آیا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ قانون کے محافظ بنتے ہو اور دوسرے کی بیوی کو گھر میں لاتے ہو۔“

”میں اپنی مرضی سے نہیں لایا۔ یہ پناہ چاہتی تھی۔ میں نے پناہ دے دی۔“

آئندہ بانو نے کہا۔ ”میں تمہارے گھر کے اندر پناہ نہیں چاہتی تھی مگر تم مجھے یہاں لے آئے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی یکے بعد دیگرے اس کمرے میں بچے داخل ہونے لگے۔ پورے چھ عدد تھے۔ اس افسر کی بیوی نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”ریوالور مجھے دے دو۔“

وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ ”کک کیوں۔ ریوالور کا تم کیا کرو گی؟ دیکھو یہ سرکاری چیز ہے۔“

اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر ہولسٹر پر ہاتھ ڈالا۔ وہ روکنا چاہتا تھا۔ چھ کے چھ بچے باپ سے لپٹ گئے۔ ریوالور بیوی کے ہاتھ میں آگیا اس نے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”بتاؤ‘ پناہ دینے والے کو گولی ماروں یا پناہ لینے والی کو۔“

آئندہ بانو نے افسر کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے تمہاری بات کا یقین ہو گیا ہے۔ تم بیوی سے محبت نہیں کرتے ہو لیکن یہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔“

یہ کہتے ہی وہ اس مکان سے نکل آئی۔ باہر چنے والا کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے کترا کر جانے لگی۔ اس نے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

وہ جھنجلا کر بولی۔ ”تمہاری وجہ سے مجھے افسر کی گاڑی میں آنا پڑا۔ میری گاڑی وہیں اجلاس والے ہال کے پاس ہے۔“

”میں گاڑی اور تمہارے ڈرائیور کو لے آیا ہوں۔“

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ تمہارے کہنے سے ادھر کیسے چلا آیا؟“

”میں نے اس سے جھوٹ کہہ دیا کہ پولیس کا افسر جبراً تمہیں اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ للذا ہمیں افسر کی بیوی اور بچوں کو گھر پہنچانا چاہئے تاکہ تمہیں رہائی مل سکے۔“

”کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟“

”میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے کیے پر پچھتا رہا ہوں۔“

”یہ ثابت ہو چکا ہے۔ پیچھا چھوڑ دو۔“

”میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدا کے لئے میری زندگی میں آجاؤ۔“

”یہ ممکن نہیں رہا۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

”ہم تم مذہب کے متعلق پوری معلومات نہیں رکھتے ہیں۔ للذا کسی عالم سے مشورہ کریں گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں طلاق دینے کے باوجود ہم کوئی ایسا کفارہ ادا کریں جس کے بعد تم میرے لئے حلال ہو جاؤ۔ جسے تم ناممکن کہہ رہی ہو‘ وہ بات ممکن ہو سکتی ہے۔“

”میں نے کہا نا۔ اسلام کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ تم جیسا بھی کفارہ ادا کرو۔ میں صرف حلالہ کے قوانین سے گزر کر ہی تمہاری زندگی میں آ سکتی ہوں اور مجھے اس پُل صراط سے گزرنا منظور نہیں ہو گا۔“

”انسانوں کی دنیا میں دماغ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو قانون بناتا ہے اور بگاڑتا ہے اور پھر اس بگڑے ہوئے قانون سے ایک نئے قانون کی تشکیل کرتا ہے۔ ہم سوچیں‘ اس پر غور کریں۔ ذرا سر کھپائیں تو کوئی نہ کوئی بات بن جائے گی۔“

”اچھا تم بات بناتے رہو مجھے جانے دو۔ گاڑی کہاں ہے؟“

”اس مکان کے پچھلی طرف ہے۔“

وہ پولیس افسر کے مکان کی طرف سے گھوم کر پچھلے راستے کی طرف جانے لگی۔ چنے والا نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”جب تک کوئی بات نہ بنے۔ میں تمہارے قریب رہ سکتا ہوں؟“

”کس حیثیت سے رہو گے؟“

”یہی تو مجبوری ہے۔ تم سے صرف ایک ہی رشتہ رکھنا چاہتا ہوں۔ چلو رشتہ نہ سہی۔ مجھے اپنا پرسنل سیکرٹری بنا لو۔“

”میں اپنا کام خود کرتی ہوں۔ کسی سیکرٹری سے نہیں کراتی پھر تم میرے سابقہ شوہر ہو۔ اب نامحرم ہو۔ تمہیں سیکرٹری بنا کر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔“

”وہ ڈرائیور جو تمہیں لئے پھرتا ہے۔ وہ بھی نامحرم ہے۔ خدا کے لئے مجھے اپنا ڈرائیور ہی بنا لو۔“

وہ اپنی کار کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اس نے اپنے سابقہ شوہر کو سر سے پاؤں تک

دیکھا۔ دل اس کی طرف مائل تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اس نے کہا۔ "ذرا اپنا حلیہ دیکھو۔ وہی پھٹا پاجامہ، میلی قمیض، گندی واسکٹ، تم بارہ لاکھ کی گاڑی میں اس حلیئے کے ساتھ بیٹھو گے۔"

"یہ بارہ کروڑ کی گاڑی ہو۔ تب بھی مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اپنا حلیہ تبدیل کرلوں گا۔ تم جیسا لباس میں کہو گی۔ اس لباس میں رہوں گا۔ کہو تو تمہارے ڈرائیور کی مخصوص وردی پہن لوں۔"

"میں تمہیں ڈرائیور کی وردی کیسے پہنچا سکتی ہوں۔ صاف ستھرے لباس میں کل سے آجاؤ اور میری گاڑی سنبھال لو۔"

وہ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ سیٹھ سلطان چنے والا خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرلیا۔ جب وہ آئندہ بانو کے پاس پہنچا تو وہ اسے حیرانی سے دیکھ کر بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سوٹ اور ٹائی میں آؤ گے۔"

کل تم نے کہا تھا۔ "مجھے ڈرائیور کی وردی میں نہیں دیکھ سکتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوٹ میں دیکھ سکتی ہو۔ پھر یہ کہ اتنی قیمتی کار میں تمہیں جانے کتنے بڑے بڑے لوگوں کے ہاں لے جانا ہوگا۔ اس لئے میں نے.........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "تم نے اچھا کیا۔ جو اچھے سے اچھا لباس پہنا لیکن میں کار کی اگلی سیٹ پر کیسے بیٹھوں۔ جب ڈرائیور چلاتا ہے تو مالکہ پیچھے بیٹھتی ہے۔"

"میں نہ تو شوہر ہوں نہ شوفر۔ لہٰذا ایک ساتھی سمجھ لو اور ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

وہ مجبوراً اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ویسے وہ خود کو غیر شعوری طور پر مجبور کررہی تھی۔ آخر دل اس کی طرف مائل تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے ڈرائیور کی جگہ کیوں دیتی۔ فی زمانہ ڈرائیور اور گھریلو ملازموں کے لئے محرم اور نامحرم کی بات اٹھائی نہیں جاتی۔ اس نے تو بات بنانے کے لئے ڈرائیور کی جگہ دی تھی۔ دنیا والے بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ تو اسکینڈل کے ذریعے بگاڑتے چلے جاتے ہیں۔

ایک تو محبت کا معاملہ ہوتا ہے۔ جس میں بدنامی لازمی ہے اگر محبت مطلقہ ہو جائے اور اس کے بعد تجدید محبت کی بات چلے تو بدنامی پہلے سے زیادہ پھیلتی ہے۔ محبت پہلی بار کی جائے تو زمانے سے ڈر لگتا ہے اور تجدید محبت ہو تو زمانے اور قانون کا ڈر نکل جاتا ہے۔ دونوں کو اس وقت تک اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہوتا ہے۔ آئندہ بانو نے سوچا۔ "وہ شوہر نہیں بن سکتا۔ دل کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ شوفر بن سکتا ہے آنکھوں کی پیاس بجھتی

رہے گی۔"

وہ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی لیکن کار کے باہر اپنے قریب بیٹھنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ وہ بڑی حسرت سے اس کی شاندار کوٹھی کو دیکھتا تھا لیکن اسے ڈرائنگ روم سے آگے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس کے باوجود وہ بدنام ہو رہی تھی۔ اگر ایک پتھر لگے تو اس کی چوٹ برداشت ہو جاتی ہے۔ محبت میں دو چار پتھر بھی سہہ لئے جاتے ہیں مگر سہنے کے ساتھ ساتھ یہ آس لگی رہتی ہے کہ پتھروں کی بارش سے گزر کر ایک دن ضرور ملن رُت آئے گی لیکن ادھر تو ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیچ میں طلاق کی دیوار کھڑی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی وہ پریشان ہو کر سوچتی۔ اس نے کیوں سلطان کو قریب کرلیا۔ اب خود ہی دور نہیں جا سکتی تھی۔ ادھر دنیا والوں کی معنی خیز نظریں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ وہ سلطان کے ساتھ بیٹھ کر کہیں بھی جاتی یا کہیں سے آتی تو لوگ ایسے دیکھتے، جیسے گناہ کر کے آرہی ہو۔

ایک روز اس نے سر پکڑ کے کہا۔ "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں ناکردہ گناہوں کی رسوائی مول لے رہی ہوں۔"

سلطان چنے والا نے کہا۔ "دراصل بڑے بڑے لوگ تمہیں اپنا بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ ناکام ہوتے ہیں تو تمہیں کھٹا انگور کہتے ہیں۔"

"ہم نے ہی انہیں کہنے کا موقع دیا ہے۔ نہ تم میرا پیچھا کرتے، نہ میں تمہیں ڈرائیور کے طور پر رکھتی اور نہ تم میرے لئے بدنامی کا باعث بنتے۔"

"لوگ تو آئندہ کے لئے ہر جائز و ناجائز کام کرتے ہیں کیا تم مجھے کسی طرح دور کرسکتی ہو۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ تم سے دور نہیں جاسکتی۔ تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔"

"سیدھا سا راستہ ہے، شادی کرلو۔"

"کیسے کرلوں؟"

"جیسے ہمارا مذہب ہمیں بتاتا ہے۔ کیا حرج ہے کسی سے شادی کرو۔ پھر طلاق لے کر عدت کے دن گزارو اور میری ہو جاؤ۔"

"جو کام مجھ سے نہیں ہو سکتا اس کی بات نہ کرو۔"

"تم دولت کمانے کے لئے سو طرح کے غیر قانونی طریقے اختیار کرتی ہو۔ ایک میری

خاطر غلط طریقہ اختیار کرو گی تو میری آئندہ بھی اچھی ہو جائے گی۔"

"غلط طریقہ کیسا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہی کہ تم کسی غیر کا منہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ کیا ضروری ہے کہ تم کسی سے نکاح پڑھاؤ۔ یہ صرف کاغذی کارروائیوں سے ہو سکتا ہے۔ کاغذ پر نکاح پڑھایا جائے گا۔ کاغذ پر طلاق ہو گی۔ کاغذ کے مطابق تم عدت کے دن گزار کر مجھ سے نکاح پڑھوا لو گی۔"

"کاغذی رشتہ عارضی رشتہ ہوتا ہے اور میں کوئی عارضی چیز نہیں ہوں۔ تم نے تو کہا تھا' انسانوں کی دنیا میں انسان بڑی چیز ہے۔ یہ دماغ قانون بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ پھر اس بگڑے ہوئے قانون سے ایک نئے قانون کی تشکیل کرتا ہے۔ کیا ہوا تمہارا دماغ؟"

"میں اس مسئلے پر دماغ کھپاتا رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔"

اسے سچ مچ یقین تھا۔ وہ اسی لئے آئندہ بانو کے اتنا قریب آ گیا تھا کہ صبح و شام ساتھ رہے گا تو دونوں طرف آگ برابر لگتی رہے گی۔ ایک شرابی کے سامنے بھری ہوئی بوتل رکھ دو۔ وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ توبہ توڑ دیتا ہے۔ عورت کے سامنے اس کا من چاہا موجود رہے تو وہ جلد یا بدیر ساری پابندیاں توڑ ڈالتی ہے۔

سلطان چنے والا کی محبت کا اونٹ نہ جانے کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔ اسی اثناء میں قومی بجٹ منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ قومی بجٹ ہر سال کی طرح پچھلے سال کے مقابلے میں متوازن بجٹ تھا۔ اس کا چونکا دینے والا ڈرامائی پہلو یہ تھا کہ کالا دھن برآمد کرنے کا مجوب نسخہ دریافت کر لیا گیا تھا۔

نئے قانون کے مطابق یہ کالا دھن تین قسم کے بانڈز کے ذریعے حکومت کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا۔ وعدہ کیا گیا تھا کہ پیش کرنے والوں کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اتنی ساری دولت کتنے ناجائز ذرائع سے حاصل کی۔ یوں کالے دھن کو صرف قانونی ہی قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ اس پر منافع کی صورت میں انعام بھی رکھا گیا تھا۔ کالے دھن سے خریدے جانے والے بانڈز ایک سال میں کیش کرائے جائیں تو اس کا منافع کچھ کم تھا دو سال بعد کیش کرائے جانے پر کچھ زیادہ تھا اور تین سال کے بعد کیش کرائے جانے پر بہت زیادہ تھا۔

اس پر کچھ لے دے بھی ہوئی۔ حکومت کے اس اقدام پر اخبارات نے اس کے مثبت اثرات اور منفی اثرات پر بھرپور تبصرہ کیا۔

اس اقدام کا مثبت پہلو یہ تھا کہ جو دولت زیرِ زمین ہے' اسے باہر لایا جائے اور ملک و قوم کی ترقی کے لئے استعمال کیا جائے۔ کسی نے سر سید احمد خان سے سوال کیا۔ "جناب! علی گڑھ یونیورسٹی کی تعمیر کے لئے طوائفوں نے بھی چندہ دیا ہے۔ اس حرام کی کمائی کو آپ کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟"

سر سید احمد نے جواب دیا۔ "اس رقم سے بیت الخلا تعمیر کرایا جائے گا۔"

اس مسئلے پر علمائے دین سے پوچھا گیا۔ ان کا جواب تھا۔ "حرام اول حرام ہے آخر حرام ہے۔ قوم کی تعلیم اور قوم کی تعمیر کے لئے حرام کی رقم استعمال نہیں کی جا سکتی۔ قانون کے مطابق کوئی غیر قانونی عمل کوئی غیر قانونی دولت کبھی قانونی نہیں ہو سکتی۔"

اخلاقیات کی رُو سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مگس کو باغ میں جانے دیجو کہ نہ دیجو۔ اگر دیجو تو پروانے کا خون ہو گا۔ نہ دیجو تو شمع روشن نہ ہو گی۔ ان حالات میں ماہرینِ اخلاقیات مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔

حکومت کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ اسے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے مطلوبہ رقم کی حصولی لازمی ہوتی ہے۔ یہ رقم حاصل کرنے کے لئے نت نئے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ مختلف اسکیمیں رائج کی جاتی ہیں۔ ان اسکیموں کے پیچھے کالا دھن چھپ جاتا ہے لیکن یہ کالا دھن حکومت کے کام آتا رہتا ہے۔

اس بار حکومت کی مجبوری اس شخص کی مجبوری نہیں تھی۔ جس نے بیک وقت تمام سونے کے انڈے حاصل کرنے کے لئے بطخ کے پیٹ کو چاک کر دیا تھا۔ حکومت کو سالِ رواں کے لئے کئی ارب روپے کی ضرورت ہے اور یقین کامل ہے کہ نیشنل بیئرر بانڈ کے ذریعے یہ رقم حاصل ہو جائے گی لیکن اس طرح کہ یہ بطخ سلامت رہے اور انڈے دیتی رہے۔

آئندہ بانو نے تازہ اخبار سلطان چنے والا کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟"

"کیا کالا دھن سفید ہو گیا؟"

"نہیں' ایک سابقہ میاں بیوی پکڑے گئے ہیں۔ بیوی نے طلاق لی تھی۔ کچھ عرصے بعد دونوں پھر ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے اور ایک ساتھ رہنے لگے لیکن قانون کسی کی ضرورت کے مطابق نہیں بدلتا' لہٰذا انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب ان پر مقدمہ بھی چلے گا۔ میری تو یہ سوچ کر جان نکلی جا رہی ہے کہ ہم پکڑے گئے تو کیا ہو گا؟"

"ہم صرف ڈرائنگ روم تک ساتھ رہتے ہیں۔"

"قانون کے رکھوالے نہ تو یہ سمجھیں گے اور نہ ہی ہم انہیں سمجھا سکیں گے۔ میں کیا کروں' نہ تمہیں چھوڑ سکتی ہوں' نہ تم سے دور رہ سکتی ہوں۔"

"دور رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے اصول کیوں اپناتی ہو کہ دولت اور اپنی دوسری ضروریات حاصل کرنے کی خاطر بے ایمانی جھوٹ اور فریب سے کام لیتی رہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تم حیا کی چادر سر پر رکھ لیتی ہو۔ کاغذی نکاح سے انکار کرتی ہو۔"

"میں جس حد تک باایمان ہوں' مجھے رہنے دو اور جس حد تک بے ایمان ہوں اسے نظرانداز کر دو۔"

"نظرانداز کردیا جائے؟ کس کس کی بے ایمانیوں کو نظرانداز کیا جائے۔ میں بھی بے ایمان تھا۔ تمہیں اپنا کر آئندہ بے ایمانی سے دولت کمانا چاہتا ہوں لیکن جہاں تک نظر انداز کرنے کی بات ہے' ہمارے ملک میں ستر ارب روپے کالے دھن کی صورت میں گردش کررہے ہیں اور یہ ستر ارب روپے اتنے ہوتے ہیں کہ اتنی سانس ایک غریب آدمی لے نہیں سکتا۔"

یہ ستر ارب روپے کسان کی محنت سے نچوڑے گئے اور مزدور کے پسینے سے ٹپکائے گئے۔

دھن کالا نہیں ہوتا لیکن طلباء اور طالبات کے مستقبل پر کالک پوت کراس دھن کو کالا گیا ہے۔

یہ ستر ارب روپے بچوں کے دودھ میں پانی ملا کر اور بیماروں کی دواؤں میں منشیات گھول کر حاصل کئے گئے۔

پولیس' انٹیلی جنس' کسٹمز اور متعلقہ شعبوں کے پاس ستر ارب روپے کا حساب بھی ہے اور یہ روپے کمانے والے بھی ان کی نظروں میں ہیں لیکن وہ کمانے والے ایسی پہاڑ جیسی شخصیت کے مالک ہیں کہ قانون کے ہاتھ ان پہاڑوں کے ہاتھ نہیں کاٹ سکتے۔ تم کہتی ہو نظرانداز کر دیا جائے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں' جب آنکھوں سے پہاڑ او جھل کیا جاسکتا ہے تو ہمارے ایک ننھے سے مسئلے کو او جھل کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ آج میں فیصلہ کرکے آیا ہوں۔"

اس نے اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ آئندہ بانو

نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ نکاح نامہ ہے۔ اس کی رُو سے ایک برس پہلے تم نے ایک شخص سے شادی کی تھی اور یہ طلاق نامہ ہے۔ آج سے چھ ماہ پہلے اس شخص نے تمہیں طلاق دے دی۔"

پھر اس نے اپنے بیگ میں سے آخری کاغذ نکال کر آئندہ بانو کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "میرج بیئرر بانڈ۔"

========ختم شد========